احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

نومبر 2020ء

ذاتِ مصطفی ﷺ مظہرِ شانِ خدا

حقیقتِ محبت اور محبتِ رسول ﷺ کا معنی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و روحانی خصوصی خطاب

تعلیماتِ غوثیہ میں صبر اور رضا بالقضا کا تصور

اصلاحِ مریدین

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی تعلیمات کی روشنی میں

تسخیرِ کائنات کے ضابطے

ایمان — علم — عمل — اخلاص

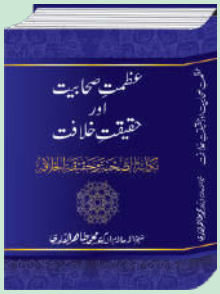

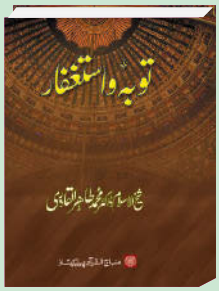

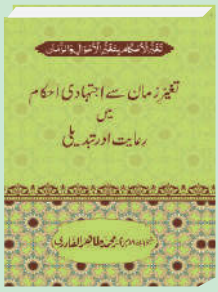

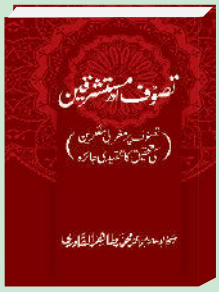

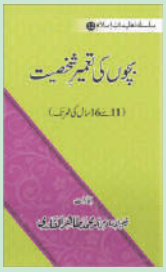

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

کی اسلام کے علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی
فقہی و قانونی، انقلابی و فکری اور عصری
موضوعات پر **600** سے زائد کتب

بفیضان نظر

قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیر سرپرستی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

زیر نگرانی

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جلد: 34 / شمارہ: 9 / ربیع الاول/ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ / نومبر 2020ء

چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی

ایڈیٹر: محمد یوسف

ڈپٹی ایڈیٹر: محبوب حسین

ایڈیٹوریل بورڈ

محمد فاروق رانا، عین الحق بغدادی

محمد رفیق نجم

مجلس مشاورت

خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم

جی ایم ملک، تنویر احمد خان، سرفراز احمد خان

منظور حسین قادری، غلام مرتضیٰ علوی

قلمی معاونین

مفتی عبدالقیوم خانؒ ہزاروی، پروفیسر محمد نصراللہ معینی

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، پروفیسر محمد الیاس اعظمی

ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، علامہ شہزاد مجددی، محمد افضل قادری

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم — گرافکس: عبدالسلام

خطاطی: محمد اکرم قادری — عکاسی: قاضی محمود الاسلام

حسن ترتیب

اداریہ: اتحادِ امت کی پاسبان، تحریک منہاج القرآن	چیف ایڈیٹر	3
القرآن: حقیقتِ محبت اور محبتِ رسول ﷺ کا معنی	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	5
دورۂ علوم الحدیث (نشست: دوم، حصہ: 5)	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	12
الفقہ: آپ کے فقہی مسائل	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	17
ذاتِ مصطفی ﷺ مظہر شانِ خدا	ڈاکٹر حسین محی الدین قادری	20
اصلاحِ مریدین: سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؓ کی تعلیمات کی روشنی میں	ڈاکٹر نعیم انور نعمانی	25
تعلیماتِ غوثیہ میں صبر اور رضا بالقضا کا تصور	ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی	30
تسخیرِ کائنات کے ضابطے	شفاقت علی شیخ	35
شہزادۂ غوث الوریٰ السید یوسف بن محمود حسام الدین القادری الگیلانیؒ کا انتقالِ پُرملال		40

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

www.minhaj.info

www.facebook.com/minhajulquran

email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس وسالانہ خریداران)

minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبرشپ/رفقاء)

smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

قیمت فی شمارہ: 35 روپے — سالانہ خریداری: 350 روپے

انتباہ! مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کیے جاتے ہیں، ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطی جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ وریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زرکا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 01970014575103 حبیب بینک فیصل ٹاؤن برانچ ماڈل ٹاؤن لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext:128

حمد باری تعالیٰ

کسے حاصل ہوا ادراک خالق کی حقیقت کا
کرے آغاز حرفِ ''کُن'' سے جو ہر ایک خلقت کا

جبینِ سجدہ جھکتی ہے بس اِک معبود کے آگے
وہی معبود جو حقدار ٹھہرا ہے عبادت کا

خدا کی اور پیمبرﷺ کی اطاعت ہم پہ لازم ہے
یہی ہے حکم قرآں کا، یہی فرمان سنت کا

فلاحِ دنیا و عقبیٰ کا ضامن دینِ پیغمبر ﷺ
قیامِ امنِ عالم راستہ ہے دینِ فطرت کا

خدا کی ذات کا عرفاں اِسی زینے سے ملتا ہے
بلا شبہ یہ قرآں ہی ہے زینہ علم و حکمت کا

ہم اُس کے نام سے ہر کام کا آغاز کرتے ہیں
ہے جس کی باءِ بسم اللہ سے وا در خیر و برکت کا

ہیں نیّر بے نشاں ہوکر بھی ہر جانب نشاں اُس کے
ہوا بے صورتی سے جلوہ پیدا اُس کی صورت کا

﴿ضیانیّر﴾

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ہم ہیں کہ جن پر عیاں خیرالبشرؐ کے راستے
کاٹ کر ظلمت بناتے ہیں سحر کے راستے

نام جب بھی سامنے آیا رسول اللہؐ کا
روشنی دل میں اتر آئی نظر کے راستے

ذّرے ذرّے کو کیا تو نے ہی منزل آشنا
ہیں معین تجھ سے خورشید و قمر کے راستے

شانِ درویشی کی منزل ہو کہ اوجِ قیصری
جو کوئی پہنچا وہ پہنچا تیرے در کے راستے

تیری رحمت سے، عنایت سے، کرم سے، لطف سے
آشیاں پر بند ہیں برق و شرر کے راستے

تجھ سے پہلے حق کی خوشبو سے چمن واقف نہ تھا
بند تھے پھولوں پہ تسکینِ سحر کے راستے

علم کا جب سے بنایا شہر خالق نے تجھے
ہوگئے آسان تر فکر و نظر کے راستے

ہیں بھُلا کر تجھ کو ہم اک ایسے رہرو کی طرح
بھول بیٹھا ہو جو خود اپنے ہی گھر کے راستے

جس طرف بھی جائیں گے ہم جاں نثارانِ رسولؐ
شمعِ ایماں سے اجالیں گے اُدھر کے راستے

اک نہ اک دن میں بھی پہنچوں گا مدینے میں ضرور
خود بناتا ہے جنوں اپنے سفر کے راستے

﴿حسرت حسین حسرت﴾

اداریہ

اتحادِ امت کی پاسبان، تحریک منہاج القرآن

تحریک منہاج القرآن کا 40 واں یوم تاسیس 17 اکتوبر 2020ء کو منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ میں شان و شوکت کیساتھ منایا گیا، یوم تاسیس کی تقریب میں ملک کی نامور، سیاسی، سماجی، مذہبی شخصیات نے شرکت کی۔ شیخ اسلام دامت برکاتہم العالیہ بھی ویڈیو لنک پر تقریب میں شریک رہے۔ یوم تاسیس کی تقریب میں مہمان مقررین نے تحریک منہاج القرآن کی علم، امن، اصلاح، تربیت کے ضمن میں قومی و بین الاقوامی سطح پر بروئے کار آنے والی مساعی کو سراہا اور خراج تحسین پیش کیا جس کی تفصیلی رپورٹ ان شاء اللہ آئندہ شمارہ میں پیش کی جائے۔

تحریک منہاج القرآن کے مقاصد واہداف میں دعوت وتبلیغ حق، اصلاحِ احوال امت، تجدید واحیائے دین، ترویج واقامتِ اسلام سرفہرست ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک قومی و عالمی سطح پر علمی، فکری، اخلاقی، روحانی، تعلیمی، شعوری، سماجی و ثقافتی انقلاب کے لئے متحرک ہے۔

اللہ رب العزت کے فضل و کرم، حضور نبی اکرم ﷺ کے نعلین پاک کے تصدق، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی زیر قیادت علم وعمل اور تعلیم وتربیت کے اس مصطفوی مشن نے 4 دہائیوں کے مختصر عرصہ میں احیائے اسلام، فکری و روحانی تربیت، اتحادِ امت، فلاحِ انسانیت اور قیام امن کیلئے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں جن سے لاکھوں افراد مستفید ہو رہے ہیں۔ منہاج القرآن کے پلیٹ فارم سے تعلیم وتربیت اور خدمت انسانیت کے لیے ایسے مثالی ادارے قائم کئے گئے ہیں جو ہر عمر کے افراد کو راہنمائی مہیا کر رہے ہیں۔ یہ عظیم ادارے ان شاء اللہ آئندہ نسلوں کی تعلیم وتربیت اور فکری آبیاری کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

منہاج القرآن نے سیرت النبی ﷺ کے فروغ، نوجوانوں کے دلوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی شمعوں کو روشن کرنے اور ان کی دینی، فکری و روحانی تربیت کے لیے عالمی میلاد کانفرنسز کا آغاز کیا۔ الحمدللہ ہر سال ان عالمی میلاد کانفرنسز میں شرق وغرب اور عالم عرب کی ممتاز علمی، روحانی شخصیات سمیت ملک کے طول عرض سے لاکھوں کی تعداد میں عشاقان رسول ﷺ جوق در جوق شریک ہوتے اور آقائے دوجہاں کی ولادت باسعادت کا جشن مناتے ہیں۔ منہاج القرآن کی یہ شہرہ آفاق عالمی میلاد کانفرنس فروغ عشق مصطفیٰ کے ساتھ ساتھ اتحاد بین المسلمین اور بین المذاہب ہم آہنگی کا استعارہ بن چکی ہے۔ ان شاء اللہ اس سال بھی عالمی میلاد کانفرنس 11 اور 12 ربیع الاول کی شب مینار پاکستان لاہور کے سبزہ زار میں منعقد ہوگی۔

تحریک منہاج القرآن کی تعلیمی و دعوتی سرگرمیوں کا مرکز ومحور نوجوان نسل ہے۔ شیخ الاسلام نوجوانوں کی تربیت کے لئے فقط پند و نصائح اور خطابات تک محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے منہاج یونیورسٹی لاہور، کالج آف شریعہ اینڈ اسلامک سائنسز، منہاج ویمن کالج، اور بامقصد ابتدائی تعلیم کے لئے منہاج ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت ملک بھر میں سینکڑوں سکول قائم کئے۔ منہاج یونیورسٹی لاہور پرائیویٹ سیکٹر کی وہ واحد یونیورسٹی ہے جس میں انتہا پسندی کے خاتمے، بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لئے سکول آف پیس، کاونٹر ٹیررازم، اور تصوف کے ڈیپارٹمنٹس قائم کیے گئے ہیں۔ یہ ڈگری پروگرامز نوجوانوں اور مختلف شعبہ جات میں خدمات انجام دینے والے پروفیشنلز میں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں۔

تحریک منہاج القرآن کے بانی و سرپرست شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کو اللہ نے تحریر وتقریر، زبان و بیان پر ملکہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کی توفیق اور نعمت سے بھی نوازا ہے۔ انھوں نے منہاج القرآن کے پلیٹ فارم

سے سینکڑوں موضوعات پر 1 ہزار سے زائد کتب تصنیف کی ہیں جن میں سے 600 کتب شائع ہو چکی ہیں اور اندرون بیرون ملک لاکھوں کروڑوں افراد ان تصنیفات اور تالیفات سے مستفید ہو رہے ہیں۔

تحریک منہاج القرآن نے اپنی دعوتی، فلاحی و اصلاحی سرگرمیوں میں پوری انسانیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ مذہب، رنگ، نسل اور وطن سے بالا تر ہو کر انسانیت کی خدمت کی ہے۔ منہاج القرآن نے خدمتِ خلق کے لیے منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن قائم کی جو مشکل کی ہر گھڑی میں دکھی انسانیت کی خدمت اور مدد کے لئے پیش پیش ہوتی ہے۔ زلزلے ہوں، سیلاب ہوں یا کووڈ 19 جیسی وبائیں منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن دینی و انسانی جذبہ کے ساتھ اپنا، قومی، انسانی کردار ادا کرتی ہے۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن پاکستان کے اندر اور باہر تعلیم، صاف پانی کی فراہمی کے منصوبہ جات پر کام کر رہی ہے، اس کے علاوہ فلسطین، شام، لبنان افریقی ممالک میں متاثرہ عوام کو خوراک اور صاف پانی کی فراہمی کے لئے اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن آرفن کیئر ہومز بھی چلا رہی ہے جہاں یتیم بچوں کی کفالت سمیت انھیں عصری معیاری تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے۔ آرفن کیئر ہومز کا دائرہ پاکستان بھر کے بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ بیرون ملک تک بڑھایا گیا ہے۔

تحریک منہاج القرآن نے قیام امن کے لئے فکری، تحریری اور تقریری سطح پر بے مثال خدمت انجام دی ہے اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ دنیا کو باور کروایا کہ اسلام انتہاپسندی کا نہیں بلکہ امن، محبت، اعتدال اور رواداری کا دین ہے۔ خدمت انسانیت کے اس باب میں 6 سو صفحات پر مشتمل انسداد دہشت گردی کا فتویٰ ایک ایسی علمی فکری کاوش ہے جسے اپنوں اور غیروں سبھی نے سراہا ہے۔ منہاج القرآن کے پلیٹ فارم سے امن نصاب مرتب کیا گیا جس کا برملا اعتراف عالم اسلام کی سب سے بڑی نمائندہ تنظیم او آئی سی کی طرف سے بھی کیا گیا ہے۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی ان فروغِ امن کاوشوں کے نتیجے میں مغربی دنیا نے اسلام کے امن بیانیہ کو پذیرائی دی اور امریکہ میں شیخ الاسلام کے امن بیانیے کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ کسی ایک فرد، ادارے کی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کی کامیابی ہے۔

تحریک منہاج القرآن نے نوجوانوں، طلبہ و طالبات کی کردار سازی اور تعلیم و تربیت کے لئے لاتعداد پروگرامز مرتب کئے جو کامیابی کے ساتھ جاری و ساری ہیں ۔ منہاج القرآن کا شہر اعتکاف روحانی ،اخلاقی تربیت کی ایک عظیم درسگاہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے جہاں ہر سال اندرون بیرون ملک سے ہزاروں تشنگان علم وعرفان شریک ہوتے ہیں اور تزکیہ نفس ،تصفیہ قلب اور اصلاح احوال کی منازل طے کرتے ہیں۔منہاج القرآن کے شہر اعتکاف میں بچے، جوان، بوڑھے ،خواتین سبھی اپنی باطنی دنیا کو بدلنے اور اللہ کو راضی کرنے کیلئے 10 دن کیلئے معتکف ہوتے ہیں۔تعلیم و تربیت کا ایک ذریعہ ای لرننگ پراجیکٹ کے تحت چل رہا ہے اور اس پراجیکٹ کے تحت اس وقت دنیا کے 40 ممالک میں مقیم مسلم خاندانوں کے بچے اور بچیاں قرآن لرننگ سمیت مختلف اسلامک کورسز سے آن لائن استفادہ کر رہے ہیں۔

تحریک منہاج القرآن ایک ایسی عالمگیر مذہبی ،اصلاحی تحریک ہے جس نے دنیا بھر میں اسلامک سنٹرز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ حقیقی معنوں میں ویمن امپاورمنٹ کیلئے سنجیدہ عملی اقدامات کئے ہیں۔منہاج القرآن ویمن لیگ کے زیر اہتمام اس وقت الہدایہ، ایگرز، وائس جیسے پراجیکٹس کے تحت لاکھوں خواتین کو تعلیم و تربیت مہیا کی جا رہی ہے۔ اسی طرح نوجوانوں اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کیلئے منہاج یوتھ لیگ ،مصطفوی سٹوڈنٹس موومنٹ اپنا شاندار کردار ادا کر رہی ہے۔منہاج علماء کونسل اسلام کے علم، امن، اعتدال اور اخوت کی تعلیمات کو عام کرنے میں پیش پیش ہے۔

(چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی)

حقیقتِ محبت اور محبتِ رسول ﷺ کا معنی

آپ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں''

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین ۔۔۔۔ معاون: محبوب حسین

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (آل عمران، ۳: ۳۱)

''(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف فرما دے گا، اور اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے''۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ایک مومن کے دل میں آپ ﷺ کی محبت کا معیار اور پیمانہ کیا ہونا چاہیے؟ اس امر کو حضور نبی اکرم ﷺ نے خود اپنے ارشاداتِ عالیہ کی روشنی میں واضح فرما دیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ " (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ، ج۱: ۱۴، الرقم: ۱۵)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک میں اسے اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں''۔

یعنی والدین، اولاد، میاں بیوی، بھائیوں، بہنوں، عزیز و اقارب، دوست احباب، خونی رشتوں، خاندانوں، مناصب اور دنیا کی کسی بھی شے کی محبت جو انسان کے دل کو مرغوب اور محبوب ہوتی ہے، جس کی طلب، رغبت اور محبت کی طرف انسان کا میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، ان سارے میلانات اور رجحانات سے بڑھ کر حضور سے محبت کرنا ایمان ہے۔ گویا جب تک کسی مسلمان کے دل میں کائنات اور عالمِ خلق کی ساری محبتوں سے بڑھ کر حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت نہ ہو تو وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے زبانِ مصطفیٰ ﷺ سے جب یہ فرمان سنا تو آقا ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا:

يَا رَسُوْلَ اللهِ، لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا مِنْ نَفْسِي. (أخرجه البخاري في الصحيح، كتاب: الأَيْمَانِ وَالنُّذُوْرِ، باب: كَيْفَ كَانَتْ يَمِيْنُ النَّبِيِّ ﷺ، ۶: ۲۴۴۵، الرقم: ۶۲۵۷)

''یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں''۔

یعنی یقیناً کائنات کی ہر شے سے بڑھ کر آپ ﷺ مجھے محبوب ہیں اور آپ ﷺ کی محبت ساری محبتوں کے مجموعے سے بھی بڑھ گئی ہے مگر میری محبت جو مجھے اپنی جان سے ہے، وہ مجھے آپ ﷺ کی محبت سے زیادہ لگتی ہے اور اپنی جان کے ساتھ میری محبت ابھی تک زیادہ اور مضبوط ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار جس طرح کیا، ہم لوگ اس طرح کا جملہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ ہم صداقت اور سچائی کے اس مرتبے پر نہیں ہیں۔ ہم باتوں کو چھپاتے ہیں، حقیقت اور غیر حقیقت میں خلط ملط

☆ حلقات التربیۃ (مئی 2020ء) کی 19 ویں نشست سے خصوصی خطاب

کرتے ہیں، اندر کی کیفیات کا ادراک نہیں کرتے اور جو سچائی اندر موجود ہے، اس کا اظہار نہیں کرتے۔ صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدینؓ اور پھر ان میں سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ مرتبۂ ایمان میں اتنے بلند تھے کہ ان کے احساسات میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی، ان کے ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں تھا، جو اخفاء میں تھا، وہی ان کے اظہار میں تھا۔ یہ ان کے ایمان کا کمال تھا کہ جو چیز انہوں نے محسوس کی، اس کا برملا اظہار حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں کر دیا۔

مذکورہ حدیث کے ذریعے یہ واضح کیا جارہا ہے کہ بندہ نہ صرف زبان سے محبت کا اقرار کرے بلکہ محبت کی کیفیات، لذّات، حلاوتیں، اثرات اور اس کے احساسات کا بھی ادراک کرے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمرِ فاروق ﷺ کی بات سُن کر ارشاد فرمایا:

لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ.

''نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! جب تک میں تمہیں اپنی جان سے بھی محبوب تر نہ ہو جاؤں (تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے)''۔

یعنی آپ ﷺ حضرت عمر فاروق ﷺ کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اے عمر! اگر آپ کو میری محبت کے مقابلے میں اپنی جان کی محبت زیادہ عزیز ہے تو ابھی آپ کا ایمان کمال کے درجے پر نہیں پہنچا۔

آقا ﷺ کے یہ کلمات حضرت عمر فاروق ﷺ کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئے اور ان کلمات کو سنتے ہی بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں عرض گزار ہوئے:

فَإِنَّهُ الآنَ، وَاللهِ، لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي.

''یارسول اللہ ﷺ! اب آپ ﷺ کی محبت میرے اندر میری جان، میرے نفس اور میری زندگی کی محبت سے بھی بڑھ گئی ہے''۔

یہ سن کر آقا ﷺ نے فرمایا:

الآنَ يَا عُمَرُ.

''اے عمر! اب تمہارا ایمان کامل ہوا ہے''۔

گویا ایمان اور دین کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب ساری محبتیں حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت کے مقابلے میں مغلوب ہوجائیں اور حضور ﷺ کی محبت ہر ایک محبت پر غالب آجائے۔

محبت کی اقسام

انسان دنیا میں جس سے بھی محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کا کوئی نہ کوئی سبب یا وجہ ضروری ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ کسی شخص یا چیز کو اپنا محبوب بنالیتا ہے۔ ان اسباب و وجوہات کی بنا پر محبت کی درج ذیل اقسام ہیں:

۱۔ فطرت اور ملاطفت پر مبنی محبت

محبت کی ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فطری طور پر کسی کے دل میں کسی کے لیے محبت ڈال دیتا ہے۔ مثلاً: والدین کی اپنی اولاد کے ساتھ محبت، شفقت، رحمت و ملاطفت فطرت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اسی طرح اولاد کی اپنے والدین سے محبت منجانب اللہ ہوتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ خونی رشتہ داری ہے۔ اس لیے دونوں سمت میں اس محبت کی بنیاد فطرت اور جبلت پر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں شفقت اور رحمت بھی شامل ہوجاتی ہے۔ یعنی شفقت و رحمت اور فطرت و جبلت یہ دو چیزیں اس محبت کی بنیاد میں جمع ہوتی ہیں۔

۲۔ رغبت و اشتہاء پر مبنی محبت

محبت کی یہ دوسری قسم طلب، رغبت اور اشتہاء کی بنا پر ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے شہوانی محبت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ جیسے کھانے پینے کی محبت، اچھے گھر، اچھی سواری، اچھا رہن سہن اور جن چیزوں میں آدمی سکون اور آرام محسوس کرتا ہے، ان کی محبت اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اس محبت کا ذکر اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں یوں فرمایا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ (آل عمران، ۳: ۱۴)

''لوگوں کے لیے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے

خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے''۔

یعنی زندگی شہوتوں اور رغبتوں کی محبت سے مزیّن کردی گئی ہے اور ان محبتوں میں انسان کے لیے کشش رکھ دی گئی ہے۔ ہم ان محبتوں کے اندر ایک طبعی رغبت، رجحان، میلان اور ایک فطری جھکاؤ محسوس کرتے ہیں۔ گھروں کے ساتھ محبت ہے، اس لیے کہ پرسکون اور پرفرحت بخش زندگی ملتی ہے۔۔۔ کاروبار کی محبت ہے، اس لیے کہ کاروبار، راحت وعزت، طاقت و آسانی اور دولت لاتا ہے۔ اسی طرح فطرت کے اچھے مناظر سے محبت ہے، اس لیے کہ اس سے دل و نگاہ کو راحت ملتی ہے۔ الغرض ہر وہ چیز جو ہماری دل و نگاہ اور جسم کو سکون و راحت دے اس سے ہم محبت کرتے ہیں، پس یہ سکون و راحت اس چیز سے محبت کی بنیاد بن جاتا ہے۔

۳۔ اجلال وتعظیم اور حُسن پر مبنی محبت

محبت کی تیسری قسم وہ ہے جو مبنی بر اجلال وتعظیم ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی مرتبۂ علم، اخلاق، فکر وفلسفہ، سوچ کی بلندی، اعمالِ صالحہ، صالحیت، تقویٰ، پرہیز گاری، کسی خاص فن، کمال اور برتاؤ میں اعلیٰ اور عظیم ہے تو اس کے اجلال، تعظیم، بزرگی، کرامت اور مہارت کی وجہ سے اس سے محبت ہوجاتی ہے۔ الغرض اپنے محاسن، محامد اور اخلاق کی وجہ سے انسان اکرم، ارفع، اعلیٰ اور بزرگ بنتا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں محبوب ہوجاتا ہے اور لوگوں کی طبیعتیں اس کی طرف اس کے کمال کی وجہ سے جھکتی ہیں۔ گویا اس کے آداب و خصائل اسے دوسروں کی نظروں میں محبوب بناتے ہیں۔

☆ اس طرح کسی کا جمال اور خوبصورتی بھی محبت کی بنیاد ہے۔ یعنی کوئی بڑا خوبصورت ہے، اس کی شکل وصورت بڑی اچھی ہے تو اس بناء پر اس سے محبت کی جاتی ہے۔ مثلاً عوام مختلف ایکٹرز، اداکاروں، کھلاڑیوں اور کسی خاص میدان میں مہارت کے حامل لوگوں کے دیوانے ہوتے ہیں تو عوام کی اس محبت کی بنیاد ان شخصیات کی خوبصورتی یا ان کا اپنے فن میں باکمال ہونا ہوتا ہے۔

۴۔ احسانِ نعمت پر مبنی محبت

محبت کی چوتھی قسم وہ ہے جس میں محبت کا سبب کسی نعمت کا احسان ہوتا ہے۔ یعنی کوئی کسی پر احسان اور بھلائی کرتا ہے، اس کو تعلیم دیتا ہے، اس کی مدد کرتا ہے، اس کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو محکومی، غلامی اور پریشانی سے نکالتا ہے، ہر وقت اس کا خیال رکھتا ہے تو اس کے ان احسانات اور بھلائیوں کے ردِعمل میں اس کے لیے محبت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ گویا اس کے احسانات محبت کی بنیاد بنتے ہیں۔

حضورﷺ سے محبت کی بنیاد جامعیت کی حامل ہے

محبت کی ان تمام اقسام میں سے والدین اور اولاد کی باہمی محبت کی قسم کو چھوڑ کر باقی ساری محبتیں حضور نبی اکرمﷺ کی ذات میں جمع ہیں۔ وہ سارے وجوہ (reasons) اور اسباب جو محبت کو جنم دیتے ہیں، وہ سارے اسباب اللہ رب العزت نے آقاﷺ کے اندر بتمام وکمال رکھ دیئے ہیں۔

پس محبت کے اسباب میں سے کبھی اسباب مادی ہوتے ہیں اور کبھی اسباب روحانی ہوتے ہیں۔۔۔ کبھی ذہنی اور فکری اسباب ہوتے ہیں اور کبھی علمی، خلقی اور خُلقی اسباب ہوتے ہیں۔۔۔ اسی طرح اسباب کبھی سیرت اور کبھی صورت سے متعلق ہوتے ہیں۔ ساری محبتیں ان اسباب میں سے کسی ایک سبب کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ ان تمام طرح کی محبتوں؛ جبلی، فطری، راحت، اکرام، اجلال، جمال، فن اور شفقت و عاطفت کے کمال کے ماحصل کا حجم اور کیفیت سے بھی حضورﷺ کی محبت بڑھ جائے، یعنی حضورﷺ کی محبت مقدار (quantity) میں بھی سب سے زیادہ ہو اور معیار (quality) میں بھی سب سے زیادہ ہو۔ اس کیفیت کے حصول کو حضورﷺ نے ایمان قرار دیا۔

محبتِ رسولﷺ کا تقاضا

محبتِ رسولﷺ کے کچھ تقاضے ہیں، جن کو مکمل کیے بغیر محبت کمال کو نہیں پہنچتی۔ ذیل میں محبت کے چند تقاضوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱۔ ایثار و قربانی

جب محبت کا یہ عالم ہوجائے کہ وہ ہر چیز سے بڑھ جائے تو یہ محبت ایثار کا تقاضا کرتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ بندہ صرف محبوب کو دیکھنا، ملنا اور سننا چاہتا ہے۔ محبوب جو کہے اس کو مانتا ہے اور محبوب کے لئے اپنا آرام قربان کرتا ہے۔ وہ اپنا ذوق، اپنی چاہت اور اپنی ترجیح کو ختم کردیتا ہے اور محبوب کے لئے مرمٹتا ہے۔ جان دینی پڑے تو جان بھی دیتا ہے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس سے محبوب نے منع فرمایا ہے۔

۲۔ محبوب کے محبوب سے محبت کرنا

وہ محبوب کو چاہتا ہے اور محبوب کے طرزِ زندگی کو اپناتا ہے۔۔۔ محبوب کی طرح کا لباس پہنتا ہے اور محبوب کی طرح کی نشست و برخاست رکھتا ہے۔۔۔ محبوب جن سے محبت کرتا ہے، وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔۔۔ وہ حسنؓ و حسینؓ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ وہ اہلِ بیت، صحابہ اور صالحین رحمہم اللہ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ حتی کہ وہ غریب اور محتاج سے بھی محبت کرتا ہے۔۔۔ انسانیت اور اللہ تعالیٰ کی پوری مخلوق سے محبت کرتا ہے۔۔۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میرے محبوبﷺ اِن تمام سے محبت کرتے ہیں۔ محبوب کی محبت جدھر جدھر جاتی ہے، محبّ کی محبت اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ محبوب ایک چیز کو چاہے اور محبّ اس کے برعکس کسی اور چیز کو چاہے۔ دونوں محبتوں کے رخ اگر مخالف سمت ہوں اور بندہ کہے کہ میں تو بڑا عاشق ہوں تو محبت و عشق کا یہ دعویٰ محبوب کی بارگاہ میں قبول نہیں۔

افسوس! ہمارا عشقِ رسولﷺ اور محبتِ رسولﷺ یہ ہے کہ آقاﷺ کی چاہت کسی اور سمت ہے اور ہماری چاہتیں کسی اور سمت ہیں۔۔۔ حضورﷺ کا فرمان کسی اور سمت ہے اور ہمارا عمل کسی اور سمت ہے۔۔۔ وہ جس چیز سے ناراض اور خفا ہوتے ہیں، ہم وہی کام کرتے ہیں۔۔۔ جس سے وہ خوش ہوتے ہیں، ہم اس کام کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔۔۔ جس کام کا وہ حکم دیتے ہیں، ہم اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔۔۔ اور جن سے وہ منع کرتے ہیں، ہم اسی کام کو انجام دیتے چلے جاتے ہیں۔ المختصر یہ کہ دعوی محبت کا کرتے ہیں مگر اعمال محبوب کی تعلیمات اور رضا کے برعکس کرتے ہیں۔

۳۔ غفلت سے احتراز

یہ بات ذہن نشین رہے کہ محبت کرنے والا کبھی غافل نہیں ہوتا۔ محبت اور غفلت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ محبت بے تاب رکھتی ہے، محبت جگاتی ہے، محبت بے چین رکھتی ہے اور محبت مستعد رکھتی ہے جبکہ ہماری زندگیوں میں غفلت اور کوتاہی ہے۔ ہم زبان اور دعویٰ کے اعتبار سے محبت کی بات کرتے ہیں جبکہ ظاہر اور باطن میں ساری زندگی ہم خلافِ محبت اعمال و احوال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ محبت، متابعت اور موافقت چاہتی ہے، وہ مخالفت گوارا نہیں کرتی۔۔۔ محبت، محبت چاہتی ہے، وہ نفرت گوارا نہیں کرتی۔۔۔ محبت ملاطفت چاہتی ہے، وہ منافرت گوارا نہیں کرتی۔۔۔ محبت قربت چاہتی ہے، وہ دوری گوارا نہیں کرتی۔۔۔ محبت ایثار و قربانی چاہتی ہے، وہ بخل اور کنجوسی گوارا نہیں کرتی۔۔۔ یعنی وہ کون سا محبّ ہے جو محبت کا دعویٰ بھی کرے اور طبیعت میں بخل اور کنجوسی بھی رکھے؟ اس تناظر میں محبت، محبّ، محبوب اور تعلقِ محبت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ تعلیمات میں فنائیت

حضور نبی اکرمﷺ کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص میں محبت کی جملہ اقسام کا کمال مل کر بھی میری محبت کے ایک ذرہ کے برابر نہ ہو تو وہ شخص ایمان میں کامل ہے۔ اسی لیے فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰه.

(آل عمران، ۳: ۳۱)

''(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں محبوب بنالے گا''۔

یعنی اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو حضور نبی اکرمﷺ کی تعلیمات کی اطاعت و اتباع میں فنا ہوجاؤ۔۔۔ آپﷺ کی رضا، حکم، منشا اور خوشی میں فنا ہوجاؤ۔۔۔ جہاں آپﷺ قدم رکھیں، یعنی جن راہوں پر چلیں اور جو طرزِ حیات متعین کریں، وہی طرزِ حیات تم اپنالو اور ان ہی راہوں پر تم بھی محوِ سفر ہوجاؤ۔۔۔ الغرض حضور نبی اکرمﷺ کے اسوہ، سیرت، چاہت،

رغبت اور ترجیح میں فنا ہو جاؤ۔

جب ایسا کر لو گے تو اللہ تمہیں صرف اپنا محبّ نہیں رہنے دے گا بلکہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا کیونکہ تم اس کے محبوب کے سچے محبّ ہو۔ اللہ کا طریق یہ ہے کہ وہ اپنے محبوبﷺ سے ایسی محبت کرتا ہے کہ جو اس کے محبوب کا سچا محبّ ہوجاتا ہے، اللہ اسے بھی اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ سچا محبّ وہ ہوتا ہے جو محبوب کے محبوب سے بھی پیار کرتا ہے اور محبوب کے محبّ سے بھی پیار کرتا ہے۔

حلاوتِ ایمان کا حصول کیونکر ممکن ہے؟

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الإِيمَانِ.

(صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان، ۱:۱۴، الرقم:۱۶)

یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص انہیں ایسا حاصل کرے اور اپنے باطن میں ایسا داخل کرے کہ اس کی پوری طبیعت، مزاج اور باطن کی کیفیت ان تین چیزوں پر استوار ہو جائے تو اس شخص نے ایمان کی حلاوت اور لذّت (Taste) کو پا لیا۔

آقاﷺ لفظِ حلاوت فرما کر ایک محسوس شے کی تشبیہ سے ایک غیر محسوس حقیقت کو سمجھا رہے ہیں۔ اس اسلوب سے اشارہ اس سمت ہے کہ جس طرح اچھے اور خوش ذائقہ کھانوں، مشروبات اور پھلوں سے لوگوں کو حلاوت و لذّت (Taste) ملتی ہے اور وہ اس حلاوت، ذائقہ اور لذّت کو محسوس کرتے ہیں، اسی طرح ایمان کی حلاوت اور لذّت کو بھی اپنے اندر محسوس کیا کرو۔ جب آدمی ایمان کی لذّت و حلاوت کو اپنے اندر محسوس کرنے لگ جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اب اس کا ایمان محض تصدیق اور اظہار کے کلمات تک نہیں رہا بلکہ ایک زندہ حقیقت بن کر اس میں رچ بس گیا ہے۔

ایمان کو حلاوت و لذّت سے آشنا کرنے والی چیزیں درج ذیل ہیں:

۱. أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا.

پہلی چیز یہ ہے کہ حلاوت و لذّتِ ایمان کے حصول کے لیے ''اللہ اور اس کے رسولﷺ ساری کائنات کی ہر شے سے بڑھ کر اسے محبوب ہو جائیں''۔ یعنی کائنات کی کوئی شے اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسولﷺ کے مقابلے میں اس کی زندگی میں عملاً ترجیح نہ رکھے۔ ہر چیز پیچھے چلی جائے اور اللہ اور اس کے رسولﷺ کی محبت اس کے اندر کائنات کی ہر شے سے بڑھ جائے۔

جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں، یہاں قدم قدم پر محبتیں ہیں جن کا ذکر **زين للناس حب الشهوات** کے الفاظ میں قرآن مجید نے کیا ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ان محبتوں سے منع نہیں کیا بلکہ فرمایا ہے کہ یہ محبتیں اللہ اور رسولﷺ کی محبت سے بڑھنے نہ پائیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ ساری محبتیں ختم کر دو۔ کیوں منع نہیں فرمایا؟ اس لیے کہ اگر ماں باپ اولاد سے محبت ختم کر دیں تو پرورش نہیں کر سکتے۔۔۔ اولاد اگر ماں باپ سے محبت ختم کر دے تو ان کی عزت اور احترام و تکریم نہیں کر سکتے۔۔۔ بھائی، بہن اگر محبت ختم کر دیں تو صلح رحمی نہیں ہوتی۔۔۔ دوست، دوست سے محبت ختم کر دے تو حقوق ادا نہیں ہوتے۔۔۔ مخلوق سے محبت ختم ہو جائے تو کسی پر احسان اور بھلائی نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی محبتیں رہیں، یہ درکار ہیں مگر اِن کا پیمانہ یہ ہے کہ جہاں اللہ اور رسولﷺ کی محبت، ان کا امر و نہی اور تعلیمات آجائیں تو وہاں یہ ساری محبتیں مغلوب ہوجائیں اور اللہ اور رسولﷺ کی محبت کائنات کی ساری محبتوں سے اعلیٰ، ارفع، قوی اور طاقتور ہوجائے۔

۲. وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ

حلاوتِ ایمان کے حصول کے لیے دوسری چیز کے متعلق رہنمائی فرمائی کہ ''جس شخص سے بھی وہ بندہ محبت کرے تو اللہ کے لیے کرے''۔ یعنی اللہ اور اس کے رسولﷺ کی محبت کا اثر اس کی شخصیت، سیرت اور طبیعت و مزاج پر ایسا ہو کہ اب اس کے نزدیک دنیا کی محبتوں کا پیمانہ بدل جائے اور اب وہ جس سے بھی محبت کرے، اللہ کے لیے کرے۔ دنیاوی محبتوں کو کسی نہ کسی طریقے سے خیر کے ساتھ جوڑ دے۔ مثلاً: اپنی اولاد سے محبت کرے تو اس میں اپنی نیت خیر کی کر لے کہ میں اولاد کی

اچھی پرورش اس لیے کر رہا ہوں تاکہ یہ نیک اور خوش اخلاق انسان بن جائے۔ یہ اچھے مسلمان بنیں، انسانیت کی خدمت کریں، حضورﷺ کی امت کا اچھا فرد بنیں، ایسا فرد بنیں کہ اللہ اور رسولﷺ راضی ہوں، یہ دین کی خدمت کریں، اچھا علم و ہنر سیکھیں تاکہ لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں، اس کے طور طرز اچھے ہوں، سچ بولنے والے ہوں، نافرمانی اور گناہ سے پرہیز کریں، ان کی سیرت عمدہ ہو اور یہ تقوی و پرہیزگاری کے پیکر ہوں۔

الغرض جس سے بھی محبت کریں یا صحبت رکھیں تو اس میں اللہ اور اس کے رسولﷺ کی محبت، ان کا حکم، ہدایات اور تعلیمات کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور شامل کرلیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ یہ بظاہر دنیاوی محبت بھی اللہ کے لیے محبت قرار پائے گی۔ گویا دنیا کے اندر بھی ساری محبتوں کی سمت اور رُخ اللہ تعالیٰ اور رسولﷺ کی رضا بن جائے۔

۳۔وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ

حلاوتِ ایمان کے حصول کے لیے تیسری چیز کی جانب متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر حلاوت و لذّتِ ایمان کے متمنی ہو تو کفر اور معصیت سے اتنی نفرت ہوجائے کہ مسلمان ہوجانے کے بعد کفر کی طرف واپس پلٹ جانا، نیک و صالح ہوجانے کے بعد واپس فسق و فجور کی طرف پلٹ جانا اور نیکو کار، عبادت گزار اور اللہ کی راہ پر چلنے کے بعد گمراہی کی راہ پر پلٹ جانا تمہارے لیے اس قدر نفرت کا باعث ہوجائے جیسے کوئی شخص آگ میں پھینکے جانے سے نفرت کرتا ہے۔

جس نے یہ تین چیزیں اپنے اندر پیدا کر لیں اور اپنی طبیعت اور مزاج کو اس پر استوار کرلیا تو دراصل اس نے ایمان کی حلاوت اور لذّت چکھ لی۔

طاعات وعبادات میں عدمِ یکسوئی کا سبب

اگر ہم اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری طبیعتیں ان تین چیزوں پر استوار ہی نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم ایمان کی لذّت و حلاوت سے محروم ہیں اور جب ایمان کی لذت میسر نہیں آتی تو ہماری عبادت، سجدوں، تلاوت، نماز، روزوں، طاعات، عبادات، حسنات اور خیرات میں بھی کوئی حلاوت و لذّت نہیں رہتی۔ ہمیں یکسوئی بھی نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی کیفیت مقدر بنتی ہے۔

ہم روزمرہ زندگی میں اس بات کا رونا روتے نظر آتے ہیں کہ عبادات و طاعات میں یکسوئی نہیں ہوتی، رجحان نہیں ہوتا لیکن کیا ہم نے کبھی اس محرومی کے سبب پر غور کیا کہ ایسا کیوں ہے۔۔۔؟ اس کا بنیادی سبب ہی یہ ہے کہ ہم نے مذکورہ تین چیزوں کو صحیح طور پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ ہماری طبیعت میں دنیا پرستی ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ اگر اللہ اور رسولﷺ کی محبت ہر محبت پر غالب نہ ہو۔۔۔ نیکی کی محبت، بدی کی محبت پر غالب نہ ہو۔۔۔ اور ہر ایک کے ساتھ رشتہ اللہ اور اس کے رسولﷺ کے لیے نہ ہو۔۔۔ تو پھر حلاوتِ ایمان نصیب نہیں ہوتی۔ یہ تین چیزیں ہمارے خیالات، رجحانات، اعمال، احوال، طور طریقے حتی کہ ہماری پوری زندگی کو کنٹرول کرتی ہیں۔

ایمان جوں جوں سنورتا ہے، یکسوئی خود بخود جنم لیتی ہے۔ یکسوئی کسی انجکشن یا ورد وظیفے سے نہیں آجاتی بلکہ یہ ایمان کے فوائد و نتائج کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر خیر کے عمل سے فائدہ ہوتا ہے مگر ہر ایک کے لیے قدرتی طریقہ کار ہے۔ مثلاً: اگر بیج بوئیں تو یہ ناممکن ہے کہ تنا اُگے بغیر پھل آجائے اور بیٹھے بٹھائے ورد وظیفے سے پھل مل جائے۔ پھل ایسے نہیں لگتے بلکہ پھل تک پہنچنے کے لیے سارے مراحل کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔ پودے کو پانی یا کھاد نہ دیں یا اسے روشنی نہ ملے اور ہم چاہیں کہ پودا بڑا ہوجائے ثمر آور درخت بن جائے تو پودے اس طرح نہ ہی درخت بنتے ہیں اور نہ ہی ان سے پھل ظاہر ہوتا ہے۔

سمجھانا مقصود یہ ہے کہ ہر چیز کے تقاضے ہیں، ساری چیزیں پوری ہوں، تب نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اگر گھر کا ماحول فسق و فجور، معصیت اور نافرمانی کا رکھیں اور اس میں اللہ، رسولﷺ اور دین کی محبت کی جگہ ہی نہ ہو بلکہ ہر طرف گناہ اور لغویات ہوں اور اس بات کی امید رکھیں کہ اس ماحول کے اندر نیکی و صالحیت کا پودا اُگ جائے اور اولاد کے اندر اچھے محاسن

و اوصاف پیدا ہوجائیں تو یہ ناممکن ہے۔ پس مذکورہ تین شرائط کو مکمل کیے بغیر حلاوتِ ایمان اور پھر بعد ازاں اس کے نتائج کا حصول ناممکن ہے۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ. (التوبہ،۹:۲۴)

’’(اے نبی مکرم!) آپ فرما دیں: اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے (محنت سے) کمائے اور تجارت و کاروبار جس کے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتا‘‘۔

اللہ اور رسول ﷺ کی محبت، دین اسلام کی محبت اور دین کے فروغ کے لیے کاوشیں کرنا، اپنی اولاد، معاشرے اور لوگوں میں دین کو مستحکم کرنا، دین کی دعوت، فکر اور کردار کو فروغ دینا اور اس کے فروغ میں انفرادی و اجتماعی سطح پر محنت کرنا، جب تک یہ تمام امور تمام دنیاوی محبتوں پر غالب نہ ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی سزا اور عذاب کا وقت قریب ہے۔

افسوس کہ ہم آج اس مرحلہ پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اعمال و احوال پر غور و فکر کرنے اور فروغ و استحکامِ دین کے لیے عملی اقدامات اٹھانے کی توفیق مرحمت فرمائے تاکہ ہم نہ صرف اللہ رب العزت کے عذاب اور پکڑ سے محفوظ رہ سکیں بلکہ اس کی محبت کے حقدار بھی بن سکیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

❁❁❁❁❁

سہ روزہ دورہ علوم الحدیث

حدیث میں سند کی اہمیت

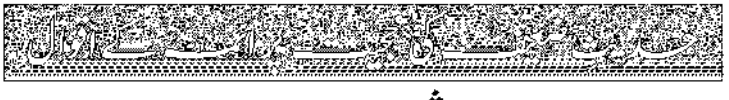

خصوصی خطاب: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین

نشست دوم
حصہ: 5

حدیث مبارک کے دو حصے ہوتے ہیں:

۱۔ سند ۲۔ متن

راویوں کے ناموں کا سلسلہ سند کہلاتا ہے اور سند کے بعد والا حصہ جو حضور نبی اکرم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر پر مشتمل ہوتا ہے، متن کہلاتا ہے۔ حدیث کے باب میں سند کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سند کی جانچ پڑتال اور جرح و تعدیل ضروری ہوتی ہے تاکہ کوئی شخص آقا علیہ السلام کی طرف جھوٹی بات منسوب نہ کر سکے یا دین میں غلط چیزوں کو داخل نہ کر سکے۔ سند کی اسی اہمیت کے پیش نظر ائمہ نے اسناد کو دین قرار دیا ہے۔ سند میں ایک ایک راوی کو پرکھا جاتا ہے۔ حدیث نبوی میں ملاوٹ قبول نہیں، اس لیے سند کی جانچ پرکھ کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے سنار زیور بنانے کے لئے سونا پرکھتا ہے اور اسے کٹھالی میں ڈال کر بھٹی میں رکھتا ہے کہ اس میں کتنا سونا ہے اور کتنی ملاوٹ ہے۔ کسی بھی دور میں کوئی شخص اپنے مذہب کو ثابت کرنے، اپنی رائے کو تقویت دینے یا امت میں فتنہ و انتشار پیدا کرنے کے لئے مختلف ناموں سے چیزیں گھڑ کر حضور کی طرف منسوب نہ کر دے، اس امر کو روکنے کے لیے سند میں موجود ایک ایک راوی کو پرکھا جاتا ہے۔

امام محمد بن سیرینؒ، امام عبداللہ بن مبارکؒ اور دیگر ائمہ فرماتے ہیں کہ جب صحابہ اور تابعین کا دور تھا تو ہم حدیث نبوی ہر ایک سے لے لیتے تھے، سند نہیں پوچھتے تھے کیونکہ بیان کرنے والا **الصحابة كلهم عدول** کے مصداق ہر کوئی عادل اور سچا ہوتا تھا یعنی کوئی صحابی آقا علیہ السلام پر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور جلیل القدر تابعین کا مرتبہ بھی یہی تھا۔ ہمیں ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ یہ معلوم کریں کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان کس نے روایت کیا ہے۔ کیونکہ ناممکن تھا کہ کوئی آقا علیہ السلام کی طرف غلط بات منسوب کرے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام ؓ آقا علیہ السلام کی زبان مبارک سے یہ ارشاد سن چکے تھے کہ

من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار.

(بخاري، كتاب الجنائز، الصحيح، باب ما يكره من النياحة على الميت، ۱: ۴۳۴، رقم: ۱۲۲۹)

جس نے میرے اوپر جان بوجھ کے جھوٹ بولا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں تیار کر لے۔

لیکن جب امت میں فتنوں کا آغاز ہوا تو ائمہ حدیث نے حفاظتِ حدیث کے پیشِ نظر سند کا آغاز کیا۔ امت میں سب سے پہلا فتنہ سیدنا عثمان غنی ؓ کی شہادت پر خوارج کی صورت میں رونما ہوا۔ بعد ازاں مولا علی شیر خدا ؓ کے زمانے میں دوسرا فتنہ جنگ صفین میں پیدا ہوا، جب خارجی باقاعدہ ایک نئے عنوان کے ساتھ وجود میں آئے اور ایک دوسرے کے خلاف تہمتیں اور کفر کے فتوے شروع ہو گئے۔ انہوں نے

☆ **خطاب نمبر: Ba-126، مقام: جامع المنہاج، بغداد ٹاؤن، مورخہ: 08 اکتوبر 2017ء، ناقل: محمد خلیق عامر**

حضرت علی ؓ اور حضرت امیر معاویہ ؓ کی بھی تکفیر کی اور اس طرح امت میں دھڑے بن گئے۔ کچھ خوارج بنے اور کچھ شیعانِ علی کے نام سے ظاہر ہوئے۔ پھر اکسٹھ (۶۱) ہجری میں واقعہ کربلا پیش آیا اور امام عالی مقام امامِ حسین ؑ اور اہل بیت اطہار ؑ شہید ہوئے۔ بنو امیہ کے لوگ اہل بیت اطہار ؑ کا نام سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح یزید کی قیادت میں قریش کے بدمعاش، چھوکرے اور لونڈوں کی حکومت ایک اور فتنہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

جب پے در پے فتنوں کا آغاز ہوا تو تابعین اور اتباع التابعین نے اہتمام کر لیا کہ اب کسی سے حدیث سنو تو اُسے اس وقت تک قبول نہ کرو جب تک یہ جانچ پڑتال نہ کر لو کہ اُس نے یہ حدیث کس سے سنی ہے۔ پس یہ ''کس سے سنی ہے'' کو جانچنے اور معلوم کرنے کے عمل سے سند کا اہتمام کیا گیا تاکہ کوئی شخص اپنے مذہب، مسلک، رائے اور ایک دوسرے کے خلاف عداوت وتعصب کے لیے کوئی بات گھڑ کر کسی صحابی کی طرف یا حضور ﷺ منسوب نہ کر سکے۔

پس حدیث کو قبول کرنے کی بنیاد اسناد پر رکھی گئی اور متن کی طرف توجہ کو مؤخر کیا گیا۔ یعنی پہلے اس جانب توجہ مبذول کی گئی کہ یہ پتہ چلے کہ روایت کس نے کیا۔

☆ سند کی اس اہمیت کے پیشِ نظر امام مسلم نے الصحیح کے مقدمے میں یہ باب قائم کیا ہے:

باب بيان أن الإسناد من الدين وأن الرواية لا تكون إلا عن الثقات. (مسلم، الصحيح، ۱: ۱۴)

اسناد دین کا حصہ ہے اور روایت ثقہ علماء، مشائخ اور ائمہ کے بغیر نہیں ہونی چاہئے۔

☆ امام ابن سیرین فرماتے ہیں:

لم يكونوا يسألون عن الإسناد، فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالكم. (مسلم، الصحيح، ۱: ۱۵)

اس سے مراد ہے کہ فتنہ سے پہلے اسناد کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، سب سچے لوگ تھے۔ جب زمانہ بدل گیا، سچوں کے زمانے میں جھوٹے بھی ساتھ آ گئے۔ مخلص کے ساتھ ملاوٹی بھی آ گئے تو ہم پوچھتے تھے کہ ہمیں پہلے اپنے رجال بتاؤ کہ تم نے کس سند سے یہ حدیث لی ہے؟

☆ ائمہ فرماتے تھے:

فانظروا عمن تأخذون دينكم.

(مسلم، الصحيح، ۱: ۱۴ مقدمہ)

دیکھو تم اپنا دین کس سے لے رہے ہو۔

یعنی دین کا مفہوم تمہارے پاس کیا ہے اور کیا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے، پہلے یہ دیکھو کہ تمہارا استاد اور شیخ کون ہے؟ تم نے یہ دین، علم اور یہ بات کس سے لی ہے؟ اگر وہ سچا، عادل، ضابط، متقی ہے اور اس میں فسق، فجور، حافظے کی کمی، جھوٹ، غفلت اور خطا نہیں ہے تو پھر اس کی بات بھی ثقہ اور معتبر ہوگی۔ اس طرح سند کی ضرورت پیش آئی اور دین کا مدار سند پر رکھا گیا۔

قرآن مجید کی روشنی میں سند کی اہمیت

قرآن مجید سے بھی سند کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اس کے لیے درج ذیل دلائل ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ سند اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے براہ راست انسانوں کو اپنی بات روایت نہیں کی بلکہ اپنے حبیب ﷺ کی سند کے ذریعے ہم تک اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ یعنی:

أخبر الله تبارك وتعالىٰ حبيبه ﷺ ورسوله ونبيه وهو أخبرنا عن الله تبارك وتعالىٰ.

یعنی اللہ نے خبر دی رسول ﷺ کو اور رسول ﷺ نے اللہ کی طرف سے ہمیں خبر دی۔

پس نبیوں کی بعثت سند قائم کرنے کی بنیاد ہے۔

۲۔ اللہ رب العزت کے فرمان: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں لفظ قُلْ میں سند ہے۔ بات اللہ کی توحید اور وحدانیت کی ہے، اللہ براہِ

راست بھی فرماسکتا تھا کہ اللّٰہ احد (اللہ ایک ہے) مگر ایسا نہ کیا بلکہ یہ اسلوب اختیار کیا کہ میرے حبیب! بات میری ہے مگر آپ بتادیں کہ میں ایک ہوں۔ اس آیت مبارکہ میں اَللّٰہُ اَحَدٌ (اللہ ایک ہے) متن ہے اور قُلْ (تم کہہ دو) سند ہے۔

۳۔ آقا علیہ السلام نے کفار مکہ کو اللہ کی توحید کی دعوت دی اور شرک کو ترک کرنے کا حکم دیا۔ کفار نے پوچھا کہ ہم نے اللہ کو دیکھا نہیں تو اسے کیسے مان لیں؟ فرمایا: میں راوی ہوں، میں تمہیں خبر دے رہا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ راوی ثقہ ہے تو انہوں نے اس ثقہ راوی پر اعتماد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ایک ہونا مان لیا۔

۴۔ کفارِ مکہ میں سے کئی نے آپ ﷺ کی بات ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ ہم آپ ﷺ کی بات کیسے مان لیں؟ فرمایا: میری ثقاہت کی بنیاد مان لو، اس لیے کہ میں ثقہ ہوں۔ فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَo

بے شک میں اس (قرآن کے اترنے) سے قبل (بھی) تمہارے اندر عمر (کا ایک حصہ) بسر کرچکا ہوں، سو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ (یونس، ۱۰: ۱۶)

یعنی میری زندگی کے 40 سال دیکھو، میں نے اگر 40 سال میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو اب بھی جھوٹ نہیں بول رہا۔ میری 40 سال کی زندگی میں تمہیں کہیں خطا، ثقاہت کے خلاف، فسق، غفلت، کذب اور رد کئے جانے کے قابل کوئی بات بھی نظر نہیں آئے گی۔ میں تو جب معصوم بچہ تھا، جس عمر میں کچھ ہوش نہیں ہوتا، تب بھی میرا ستر ننگا نہیں ہوتا تھا۔

پس اللہ کا ایک ہونا آقا علیہ السلام نے اپنی حیاتِ مبارکہ اور اپنی ذات کی سند کے اصح الاسانید ہونے سے منوایا۔

۵۔ سورۃ فاتحہ میں اللہ کے حضور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے الفاظ کی صورت میں مومن کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْo

سیدھا راستہ اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام فرمایا۔

باری تعالیٰ! ہم نے ہدایت صراطِ مستقیم کی مانگی مگر تو نے اپنے بندوں کے پیچھے چلا دیا۔ فرمایا: اس لیے کہ نیک بندوں کے بغیر ہدایت مل ہی نہیں سکتی۔ یہ صحیح سند ہے، اسے قبول کرو۔

اور اس حکم کے معاً بعد فرمایا:

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَo

یعنی جو غضب یافتہ اور گمراہ ہیں، یہ مثلِ موضوع ہوگئے، اُن کو ترک کرو اور سندِ صحیح اور حسن کے ساتھ چلو۔ اچھے لوگوں کے پیچھے چلو۔ گویا اللہ نے اپنا دین بھی خیرالرجال کے ساتھ مشروط اور مقرون کر دیا ہے۔

۶۔ اللہ نے انبیا کرام علیہم السلام کو سند بنایا اور ان کے ذریعے دین عطا فرمایا:

☆ کبھی فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى کے الفاظ کے ذریعے تصدیق فرمائی کہ میری بات کی سند حضور ﷺ ہیں۔

☆ کبھی وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کے الفاظ کے ذریعے اعلان فرمادیا کہ میں نے انہیں ہر چیز کا علم دے دیا، لہذا یہ میری سند ہیں۔

۷۔ بعد ازاں جب آقا علیہ السلام نے دین دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سند بنایا اور وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ کے ذریعے واضح فرمادیا کہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ''تمہیں اللہ نے سکھایا'' بلکہ سکھانے والے میرے رسول ہیں۔ تمہیں اللہ نے براہِ راست نہیں سکھایا، لہذا جن کو رسول ﷺ نے سکھایا، اب وہ باقی تمام امت کے لیے سند ہیں۔

پس اللہ نے حضور ﷺ کو علم دیا۔۔۔ رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علم دیا۔۔۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تابعین کو علم دیا۔۔۔ تابعین نے اتباع التابعین کو علم دیا۔۔۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سند کی وہ سنت جو اللہ نے قائم کی تھی، اُس پر پورا دین قائم ہوا۔

یاد رکھیں! علم سند کے ساتھ ہوتا ہے اور بے سند علم رات

کے اندھیرے میں ہاتھ مارنا ہے۔ اندھیرے میں ہاتھ میں سانپ آ جائے اور ہم سمجھیں کہ رسی ہے، تو یہ عمل ہماری موت کا سبب بن جائے گا۔ اسی طرح سند اور تحقیق و تنقیح کے بغیر علم لیں گے تو ممکن ہے کہ وہ سانپ ہو اور ہمیں ڈس لے، جس سے ہمارا عقیدہ خراب ہو جائے اور ایمان مر جائے۔ لہٰذا دن کی روشنی میں علم لینا چاہئے اور دن کی روشنی سند کے ساتھ آتی ہے۔

حدیث ضعیف کی حجیت اور سند کی بحث سے متعلق کتب

حدیث ضعیف کی حجیت اور سند کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر متعدد ائمہ نے اپنی اپنی کتب میں ابواب قائم کیے ہیں، ان میں سے چند حوالہ جات درج ذیل ہیں:

۱۔ خطیب بغدادی (الکفایة) ۲۔ ابن عدی (الکامل)
۳۔ امام حاکم (مستدرك) ٤۔ امام زرکشی (النکت)
٥۔ امام عسقلانی (النکت) ٦۔ امام عراقی (النکت)
۷۔ سخاوی (فتح المغیث) (القول البدیع)
۸۔ امام ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل)
۹۔ امام سیوطی (تدریب الراوی)
۱۰۔ امام بیہقی (دلائل النبوة)
۱۱۔ ابن جماعہ (المنهل اللطیف)
۱۲۔ امام رملی (فتاویٰ) (محاسن الإصطلاح)
۱۳۔ امام عسقلانی (القول المسدد)
۱٤۔ امام نووی (التقریب) (المجموع) (کتاب الأذکار) (شرح المهذب)

الغرض اکابر ائمہ کی کتب کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اس اصول پر باب بنائے اور نصوص و روایات لکھی ہیں کہ حدیث ضعیف نہ صرف قبول ہے بلکہ اُس پر عمل بھی ہوتا ہے مگر اُس کی روایت میں لچک اور نرمی اختیار کی جاتی ہے۔ اگر حدیث ضعیف کو کلیتًا رد کر دیا جاتا تو اُس کی روایت میں نرمی کا اُصول وضع نہ ہوتا۔

حدیث ضعیف کی حجیت پر ائمہ کے اقوال

۱۔ امام عبد الرحمٰن بن مھدیؒ اکابر ائمہ میں سے ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے زمانہ کے ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم نے ان کے طریق سے احادیث لی ہیں۔ یہ فن حدیث میں امام تھے۔ آپ حدیث ضعیف کی حجیت کے حوالے سے فرماتے تھے:

إذا روينا عن النبي ﷺ في الحلال والحرام والأحكام شددنا في الأسانيد وانتقدنا الرجال، وإذا روينا في فضائل الأعمال والثواب والعقاب والمباحات والدعوات تساهلنا في الأسانيد.

(الزركشي، النكت على مقدمة ابن الصلاح، ۲: ۳۰۸)
(السخاوي، فتح المغيث، ۱: ۳۵۰)

جب ہم حلال اور حرام کے مسئلے کو روایت کرتے تو ہم سند کی بڑی سختی کرتے اور راویوں میں بڑی تنقید کرتے اور جب ہم فضائل اور ثواب کے امور پر حدیث کو روایت کرتے تو اسانید میں نرمی کرتے تھے اور رجال اور رواۃ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

۲۔ امام سفیان ثوریؒ رجال میں فرق کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

لا تأخذوا هذا العلم في الحلال والحرام إلا من الرؤساء المشهورين بالعلم الذين يعرفون الزيادة والنقصان. فلا بأس بما سوى ذلك من المشايخ.

(ابن عدي، الكامل، ۱:۲۵۷)
(خطيب بغدادي، الكفاية، ص:۱۳۳)

جب حلال اور حرام کا معاملہ ہو تو صرف اُن لوگوں سے روایت قبول کرو (علم لو) جو اپنے علم، ضبط، عدالت اور مقام میں مشہور ہیں اور جو الفاظ کی کمی بیشی (زیادہ، کمی) کو سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی معاملات ہوں تو تمام مشائخ سے لے لیا کرو۔

۳۔ امام عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنی مجلس میں ایک امام سے ایک حدیث روایت کی تو ایک شخص نے کہا:

هذا رجل ضعيف. یہ راوی ضعیف ہے۔

قال: يحتمل أن يروى عنه هذا القدر.

آپ نے فرمایا: میں جس موضوع میں اس سے روایت کر رہا ہوں، اس قدر اس سے روایت کرنا جائز ہے۔

یعنی ضعیف ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ اُس سے روایت نہ کیا جائے۔ گویا ائمہ حدیث میں سے کسی ایک کا بھی یہ مذہب نہیں رہا۔ ضعیف راوی سے مسائلِ ثواب، مسائلِ عقاب، مسائلِ ترغیب و ترہیب اور فضائل میں روایت کرنا جائز ہے۔

پوچھا گیا: **مثل أي شيء كان؟** کس شے میں ایسے ضعیف راویوں سے روایت لینا جائز ہے؟

قال: في أدب، في موعظة، في زهد، أو نحو هذا.

(ابن ابی حاتم الرازی، الجرح والتعدیل، ۳۰:۲)

انہوں نے کہا: اگر زہد، فضیلت، ادب، نصیحت اور تربیت کا معاملہ ہو اُس میں ضعیف رواۃ سے لینا جائز ہے۔

۴۔ امام سفیان بن عیینہؒ نے ایک راوی بقیۃ کے بارے میں فرمایا:

لا تسمعوا من بقية ما كان في سنة واسمعوا منه ماكان فی ثواب وغيره.

یعنی اُن سے سماع نہ کیا کرو، وہ ضعیف ہے لیکن اگر ثواب اور فضائل کا معاملہ ہو پھر اُس کی روایت کو لے لیا کرو۔ حلال و حرام کا معاملہ ہو تو اس کی روایت نہ لیا کرو۔

(خطیب بغدادی، الکفایۃ، ص: ۱۳۴)

سنۃ سے مراد عقیدہ ہے یعنی عقیدہ کی بات ہو، اصول کے مسائل و احکام ہوں تو ضعفاء سے نہ لیں لیکن اگر فضائلِ اعمال کے مسائل ہوں تو ضعفاء سے لے لیں۔

۵۔ امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانے کے جملہ ائمہ و محدثین کے طریقے کے متعلق فرماتے ہیں کہ

إذا روينا عن رسول الله ﷺ في الحلال والحرام والسنن والأحكام تشددنا في الأسانيد. وإذا روينا عن النبيِّ في فضائل الاعمال... تساهلنا فی الاسانيد.

(خطیب بغدادی، الکفایہ، ص: ۱۳۴)

مراد یہ ہے کہ سب کا یہ طریق تھا اور ہے کہ جب ہم حلال و حرام اور سنن و احکام میں روایت کرتے یعنی جس روایت میں دین کے احکام و عقائد کے متعلق کوئی بات کہی گئی ہوتی تو پھر ہم سند میں بڑی سختی کرتے ہیں اور اگر ثواب اور فضائل کا معاملہ ہو تو اسناد میں نرمی کرتے ہیں۔

گویا امام احمد بن حنبلؒ نہ صرف اپنا بلکہ امام شافعی، امام مالک، عبدالرحمٰن بن مہدی، امام محمد بن حسن، قاضی ابو یوسف، وکیع بن الجراح، عبداللہ بن مبارک، امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ اور دیگر ائمہ و محدثین کے متعلق بتا دیا کہ ہم سب حلال و حرام اور احکام و عقائد سے متعلقہ احادیث کی پرکھ میں بڑی سختی کرتے ہیں، جرح و تعدیل میں شدت اختیا کرتے ہیں لیکن اگر اعمال کی فضیلت اور ثواب کے معاملات میں روایت کریں، جس میں الگ سے کوئی حکمِ شریعت وضع نہ ہو رہا ہو تو پھر ہم اسانید میں اور راویوں میں نرمی اور لچک سے کام لیتے ہیں۔

حدیث ضعیف کے حوالے سے مذکورہ تمام گفتگو اس ضمن میں ابھی صرف ایک باب ہے اس موضوع پر مزید عظیم الشان علمی ابحاث ہیں، جن پر گفتگو ان شاء اللہ اگلی نشست میں ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ حدیث ضعیف کے حوالے سے مذکورہ گفتگو سے بھی الحمدللہ تعالیٰ بہت سے دروازے کھلے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلامی تعلیمات سمجھنے کی توفیق دے اور علم کی وقعت اور قدرومنزلت ہمارے دل و دماغ میں راسخ فرمائے۔ آمین بجاہ سیدالمرسلین ﷺ (جاری ہے)

❁❁❁❁❁

نوٹ: کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن کے باعث چونکہ گزشتہ پانچ ماہ شمارہ شائع نہیں ہوسکا لیکن اس دوران شمارے کو باقاعدگی کے ساتھ آن لائن جاری کیا جاتا رہا ہے۔ لہذا سہ روزہ دورۂ علوم الحدیث کی نشست اول کا آخری حصہ اور نشست دوم کے چار حصے www.minhaj.info پر ملاحظہ فرمائیں۔

الفقہ: آپ کے فقہی مسائل

اوامر و نواہی کیلئے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہے

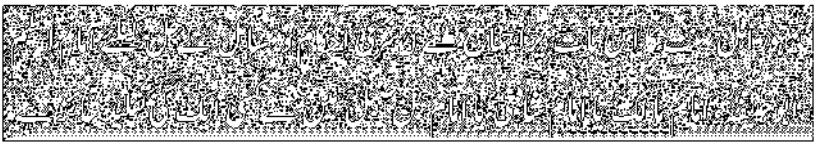

مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: اہلِ سنت کے چار مکاتبِ فقہ ہیں جن میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی شامل ہیں۔ کیا ایک شخص کے لیے ان چاروں فقہ پر عمل کرنا جائز ہے یا پھر کسی ایک فقہ پر عمل کیا جائے گا؟ اس بارے راہنمائی کر دیں۔

جواب: اس کے لیے کلام اللہ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کی اتباع کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ حلال و حرام، جائز و ناجائز اور اوامر و نواہی کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت لازمی ہے۔

قرآن و سنت میں دو طرح کے احکام ہیں:

بعض احکام محکم اور واضح ہیں جن میں اِجمال، اشتباہ، اِبہام یا تعارض نہیں، انھیں پڑھنے والا ہر شخص بغیر کسی اُلجھن کے اُن کا مطلب آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی فرضیت ہے اور زنا، شراب نوشی، چوری، فساد فی الارض اور قتل وغیرہ کی حرمت ہے۔

اس کے برعکس قرآن و سنت کے بعض احکامات میں عام آدمی کم علمی کے باعث واضحیت نہیں رکھتا۔ جیسے عبادات اور معاملات وغیرہ کے فروعی مسائل۔ قرآن و سنت سے ان احکام کے مستنبط اور اخذ کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی فہم و بصیرت پر اعتماد کر کے اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کر لیں اور اس پر عمل کریں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے قرونِ اولیٰ کے جلیل القدر اسلاف کی فہم و بصیرت پر اعتماد کریں اور انہوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔

چونکہ عام مسلمان قرآن و حدیث سے احکامِ شرع کے قواعد و ضوابط کو سمجھ کر مسائل اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے جمہور اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ شرعی احکام و مسائل کے حل کے لیے امامِ اعظم ابوحنیفہ یا امام مالک یا امام شافعی یا امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ میں سے کسی ایک کی تقلید واجب ہے۔ کیونکہ مذکورہ ائمہ اپنے تقویٰ، زہد و ورع، ثقاہت و دیانت، علم و فکر اور کردار کے حوالوں سے اعلیٰ ترین مقام و مرتبہ کی حامل قرونِ اولیٰ کی ہستیاں ہیں۔ انہوں نے امت کی سہولت کی خاطر نہایت جانفشانی اور دیانت و لیاقت سے مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کیا۔ شریعتِ اسلامی کے ایسے اصول و قواعد وضع کئے جس سے عام مسلمانوں کو دین فہمی اور شرعی احکام پر عمل پیرا ہونے میں سہولت ہوئی۔ صدیوں سے علماء کرام ان کے اقوال پر فتوی دیتے آئے ہیں۔ اللہ مجدہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

''سو تم اہلِ ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں خود (کچھ) معلوم نہ ہو''۔ (النحل،۱۶:۴۳)

کسی امام یا مجتہد کی تقلید کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے بذاتِ خود واجب الاطاعت سمجھ کر اتباع کی جا رہی ہے یا اُسے شارع (شریعت بنانے والا، قانون ساز) کا درجہ دے کر اس کی ہر بات کو واجب الاتباع سمجھا جا رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پیروی تو قرآن و سنت کی مقصود ہے لیکن قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنے کے لیے بحیثیت شارحِ قانون اُن کی بیان کی ہوئی تشریح وتعبیر پر اعتماد کیا جا رہا ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کے طریقہ پر احکامِ شرعیہ بجا لانا تقلیدِ شخصی کہلاتا ہے، مثلاً امامِ اعظم ابو حنیفہ یا امام مالک یا امام شافعی یا امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ میں سے کسی کے طریقے پر عمل کرنا۔

تقلیدِ شخصی کی شرعی حیثیت میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أَنَّ الْأُمَّةَ قَدْ اجْتَمَعَتْ عَلَى اَنْ يَعْتَمِدُوْا عَلَى السَلَفِ فِيْ مَعْرَفَةِ الشَرِيْعَةِ، فَالتَّابِعُوْنَ اعْتَمَدُوْا فِيْ ذٰلِكَ عَلَى الصَحَابَةِ، وَ تَبَعُ التَابِعِيْنَ اعْتَمَدُوْا عَلَى التَّابِعِيْنَ، وَ هٰكَذَا فِيْ كُلِّ طَبَقَةٍ إِعْتَمَدَ الْعُلَمَاءُ عَلَى مِنْ قَبْلِهِمْ.

(شاہ ولی اللہ، عقد الجید، ۱: ۳۱)

امت نے اجماع کر لیا ہے کہ شریعت کی معرفت میں سلف صالحین پر اعتماد کیا جائے۔ تابعین نے اس معاملہ میں صحابہ کرام پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا۔ اسی طرح ہر طبقہ میں علماء نے اپنے پہلے آنے والوں پر اعتماد کیا۔

اسی طرح تقلیدِ شخصی کو لازم کرنے کی ایک واضح نظیر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن کا واقعہ ہے، جب انہوں نے قرآنِ حکیم کا ایک رسم الخط متعین کر دیا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے پہلے قرآنِ حکیم کو کسی بھی رسم الخط کے مطابق لکھا جا سکتا تھا کیونکہ مختلف نسخوں میں سورتوں کی ترتیب بھی مختلف تھی اور اس ترتیب کے مطابق قرآنِ حکیم لکھنا جائز تھا۔ لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے امت کی اجتماعی مصلحت کے پیشِ نظر اس اجازت کو ختم فرما کر قرآن کریم کے ایک رسم الخط اور ایک ترتیب کو متعین کر کے امت کو اس پر متفق و متحد کر دیا اور امت میں اسی کی اتباع پر اجماع ہوگیا۔

(بخاری، الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب: جمع القرآن، ۴: ۱۹۰۸، رقم: ۴۷۰۲)

مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کا فائدہ یہ ہے کہ عام مسلمان تفرقہ و انتشار سے بچ جاتا ہے۔ اگر تقلیدِ مطلق کی عام اجازت ہو اور ہر شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جس مسئلے میں جس فقیہ کی چاہے تقلید کر لے تو اس قسم کے اقوال کو جمع کر کے ایک ایسا مذہب تیار ہو سکتا ہے جس میں دین خواہشات کا کھلونا بن کر رہ جائے گا، جسے کسی بھی طور پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فقہاء کے نزدیک اب تقلیدِ شخصی کی پابندی ضروری ہے اور کسی ایک مجتہد (کے مکتبِ فکر) کو معین کر کے ہر مسئلے میں اسی کی پیروی کی جائے تاکہ نفسِ انسانی کو حلال وحرام کے مسائل میں شرارت کا موقع نہ مل سکے۔

سوال: قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یا قرآن سر پر رکھ کر قسم کھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: قسم کھانے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ماضی میں ہونے والے کسی کام یا واقعہ کے متعلق قسم کھانا۔

۲۔ مستقبل میں کسی کام کی قسم کھا لینا

صورتِ اول کی مزید دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ قسم جو لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے کھائی گئی ہو، یعنی انسان ماضی کے کسی واقعہ کے متعلق غلط فہمی کی بنیاد پر قسم کھائے کہ فلاں کام ایسے ہوا تھا، لیکن حقیقت میں ویسا نہ ہو۔ اِسے یمینِ لَغْو یعنی غلط فہمی کی قسم کہا جاتا ہے اور اس پر نہ گناہ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی کفارہ ہے۔

۲۔ ماضی میں ہونے والے کسی کام کے متعلق قسم کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی گزرے ہوئے واقعہ کے متعلق جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے قسم کھائے، یہ یمینِ غَموس یعنی جھوٹی قسم کہلاتی ہے۔ یمینِ غموس حرام ہے، اس کا کوئی مالی کفارہ تو نہیں، البتہ اس پر توبہ و استغفار لازم ہے اور

آئندہ ایسا کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

مستقبل کے کسی معاملے کے متعلق کھائی گئی قسم **یمینِ منعقدہ** کہلاتی ہے۔ ایسی قسم توڑنا منع ہے اور توڑنے کی صورت میں قسم کھانے والے پر کفارہ لازم آتا ہے۔ اس کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو یا غلام میسر نہ ہو تو پھر دس مسکینوں کو دو وقت کا پیٹ بھر درمیانے درجے کا کھانا کھلانا، اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پھر دس مسکینوں کو اوسط درجے کا لباس فراہم کرنا ہے۔ اگر تینوں میں سے کسی صورت کو بھی اختیار کرنے کی مالی استطاعت نہ ہو تو مسلسل تین روزے رکھنا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ قسم کسی بات کے انکار کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے نہ کہ اپنا دعویٰ ثابت کرنے لے لیے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو شخص حاضر ہوئے، ایک مقام حضرموت سے اور دوسرا کندہ سے۔ حضرمی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! اس شخص (کندی) نے میرے باپ کی طرف سے ملی ہوئی زمین کو مجھ سے چھین لیا۔ کندی نے کہا: وہ میری زمین ہے اور میرے تصرف میں ہے، میں اس میں زراعت کرتا ہوں، اس شخص کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرمی سے پوچھا: تمہارے پاس گواہ ہیں؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

فَلَكَ يَمِينُهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ الرَّجُلَ فَاجِرٌ لَا يُبَالِي عَلَى مَا حَلَفَ عَلَيْهِ وَلَيْسَ يَتَوَرَّعُ مِنْ شَيْءٍ فَقَالَ لَيْسَ لَكَ مِنْهُ إِلَّا ذَلِكَ فَانْطَلَقَ لِيَحْلِفَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ، لَمَّا اَدْبَرَ اَمَا لَئِنْ حَلَفَ عَلَى مَالِهِ لِيَاْكُلَهُ ظُلْمًا، لَيَلْقَيَنَّ اللهَ وَهُوَ عَنْهُ مُعْرِضٌ.

پھر اس (کندی) شخص کی قسم پر فیصلہ ہو گا۔ حضرمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! یہ جھوٹا ہے، جھوٹ پر قسم اٹھا لے گا، یہ کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔ جب کندی قسم کھانے کے لیے مڑا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر اس شخص نے اس کا مال کھانے کے لیے قسم کھائی ہے تو جب یہ اللہ سے ملاقات کرے گا تو وہ اس سے ناراض ہوگا۔

(مسلم، الصحیح، کتاب الإیمان، باب وعید من اقتطع حق المسلم بیمین فاجرۃ بالنار، ۱: ۱۲۳، الرقم: ۱۳۹)

مذکورہ بالا تصریح سے ثابت ہوا کہ مدعی ثبوت پیش کرتا ہے، اگر اس کے جواب میں مدعیٰ علیہ کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو تو اپنی صفائی کے لیے قسم یا حلف دیتا ہے۔

قسم قرآنِ مجید پر ہاتھ رکھ کر کھائی جائے، قرآنِ مجید سر پر رکھ کر کھائی جائے یا بغیر قرآن اٹھائے کھائی جائے، قسم یکساں ہی رہتی ہے۔ قرآنِ مجید پر ہاتھ رکھنا یا قرآنِ مجید سر پر رکھنا محض اپنی قسم کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ کوئی شخص قرآنِ مجید سر پر رکھ کر صحیح بات کہے یا بغیر قرآن کو اٹھائے سچ کہے برابر ہے، تاہم قرآنِ مجید سر پر رکھ کر یا قرآنِ مجید پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم کھانا گناہ کی سنگینی کو بڑھا دیتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قسم کھاتے ہوئے قرآنِ مجید سر پر رکھنا یا قرآنِ مجید پر ہاتھ رکھنا اپنی قسم کی اہمیت جتانے کے لئے کیا جاتا ہے، اسی طرح کسی سے قسم لیتے ہوئے اس کے سر پر قرآنِ مجید رکھنا یا قرآنِ مجید پر ہاتھ رکھوانا اسے ڈرانے کے لیے ہوتا ہے تاکہ وہ جھوٹی قسم نہ کھائے۔

❁❁❁❁❁

قارئین متوجہ ہوں!

کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن کے باعث ماہنامہ منہاج القرآن کے چھ شمارے ماہ مئی 2020ء تا اکتوبر 2020ء شائع نہیں ہوسکے۔ اس دوران ماہنامہ منہاج القرآن باقاعدگی کے ساتھ آن لائن جاری کیا جاتا رہا ہے۔ لہذا گزشتہ تمام شماروں سے استفادہ کے لیے www.minhaj.info ملاحظہ فرمائیں۔

ذاتِ مصطفی ﷺ مظہرِ شانِ خدا

اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو کثیر شانیں اور اپنی صفات کے رنگ عطا کئے

ہر کلمہ گو پر لازم ہے کہ وہ آقا ﷺ کی تعلیمات کو حرزِ جاں بنائے

ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

ائمہ وعلماء نے ایمان کے کئی درجات بیان فرمائے ہیں، اگر وہ درجات مکمل نہ ہوں تو ایمان کامل نہیں بنتا بلکہ ناقص رہ جاتا ہے۔ مثلاً: ایمان کبھی نظری طریق سے حاصل ہوتا ہے، یعنی انسان کسی شے کو دیکھتا ہے اور اس پر اعتماد کرتا ہے لیکن یہ کامل ایمان نہیں ہے، اس لیے کہ کامل ایمان وہ ہے کہ دل جس کی تصدیق کرے، زبان جس کا اقرار کرے اور جس شے یا عقیدے پر ایمان ہے اس پر انسان کے جسم کے تمام اعضاء عمل کریں۔ لہذا یہ تینوں چیزیں جب تک ایمان میں داخل نہ ہوں تو ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو یوں آشکار کیا۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ .

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے''۔ (البقرہ،۲: ۲۷۷)

یعنی ایمان لانے کے ساتھ ساتھ عملِ صالح کی شرط بھی ہے کہ جب انسان زبان سے اقرار کرتا ہے تو اس کے پیچھے دل کی تصدیق بھی ہو اور اس کے بعد وہ اس اقرار پر عمل بھی کرے۔

اللہ رب العزت نے جب تمام ارواح کو پیدا کیا تو ان سے ایک سوال فرمایا:

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ط قَالُوْا بَلٰی. (الاعراف،۷:۱۷۱)

''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، وہ (سب) بول اٹھے: کیوں نہیں؟ (تو ہی ہمارا رب ہے)''۔

اس اقرار کا مطلب یہ ہے کہ ان ارواح نے عالمِ ارواح میں کیے گئے وعدے پر دنیا میں آنے کے بعد عمل بھی کرنا ہے کیونکہ اگر عمل نہ کریں تو وہ وعدہ ادھورا رہ جاتا ہے اور اظہارِ ایمان ناقص رہ جاتا ہے۔

لفظ ''رب'' میں پنہاں حکمت

اللہ رب العزت کے بہت سے اسماء اور صفات ہیں جس سے اُس کی مختلف شانوں کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس آیت مبارکہ میں جب اس نے ارواح سے سوال کیا تو ایک خاص صفت ''ربوبیت'' کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ کیا میں تمہارا خالق نہیں ہوں؟ کیا میں تمہارا رازق نہیں ہوں؟ کیا میں تمہارا علیم نہیں ہوں؟ کیا میں خبیر نہیں ہوں؟ یہ سب بھی اسی کے نام ہیں لیکن اس نے جب ارواح سے وعدہ لیا کہ کیا تم مجھے مانتے ہو کہ میں تمہارا رب ہوں؟ تو اس نے یہ وعدہ کسی اور اسم اور صفت پر نہیں لیا بلکہ صفتِ ربوبیت پر لیا ہے۔

لازمی بات ہے کہ اس اسلوب میں کوئی خاص حکمت کار فرما ہے۔ اس حکمت کو جاننے کے لیے لفظ ''رب'' کے معنی پر غور کرنا ہوگا کہ اس صفت میں کیا خاص بات ہے کہ جب ارواح سے وعدہ لیا، تب بھی اپنی صفت ربوبیت کا اظہار فرمایا اور پھر جب قرآن مجید کا آغاز کیا تو وہاں بھی ''الحمدللہ رب العالمین'' کے الفاظ بیان فرمائے۔

ائمہ ومفسرین اللہ رب العزت کی صفتِ ربوبیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لفظ ''رب'' سے مراد مربّی اور مالک ہے۔ کسی کی تربیت کرکے بتدریج اس کو کمال تک لے

جانا ربوبیت ہے۔ کوئی رب، کامل رب تب بنتا ہے یا کسی کی صفتِ ربوبیت اپنے کمال کو تب چھوتی ہے جب کوئی کسی کی کماحقہٗ تربیت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسی صورت میں وہ صفتِ ربوبیت کا کمال پاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے مذکورہ آیات میں جب لفظ ''رب'' استعمال فرمایا تو اس کے ذریعے اپنی تمام صفات کا اظہار فرمادیا۔ صفتِ ربوبیت ایسی جامع اور اعلیٰ صفت ہے جس میں صفتِ رزاقیت بھی آجاتی ہے، اس کا علیم وخبیر ہونا بھی شامل ہے، زندگی وموت دینا بھی اس میں آجاتا ہے کیونکہ کسی کی کامل تربیت کرنے کے لیے ہر پہلو کو پروان چڑھانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اگر کوئی کسی کی کفالت میں ہے تو اسے صرف کتابیں پڑھائے مگر کھانا نہ دے یا اسے ذکر اذکار سکھائے مگر لباس نہ دے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے والدین کے لیے بھی لفظ ''رب'' استعمال فرمایا ہے۔ ان کو بھی ''رب'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب اولاد ان کے زیر سایہ ہوتی ہے تو ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا والدین کی ذمہ داری ہے۔ وہ ان کی تعلیم، خوراک، لباس، رہائش، صحت، تربیت الغرض والدین جملہ پہلوؤں سے اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے والدین کو مجازاً رب کہا جاتا ہے۔ اللہ رب العزت کی ربوبیت کا کمال یہ ہے کہ جس شے کو وہ بتدریج کمال تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کے لیے اپنی ہر صفت کو کام میں لاتا ہے۔ جب اس نے عالمِ ارواح میں اپنی سب سے اعلیٰ صفت ربوبیت کے ذریعے ارواح سے وعدہ لیا تو اب ارواح کا اللہ سے یہ وعدہ اس کی صرف ایک صفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ ارواح نے اس کی ہر صفت پر اس سے وعدہ کیا ہے۔

درجات میں فرق کی بنیاد علم ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام ارواح سے اللہ رب العزت وعدہ لے رہا تھا تو کیا وہاں موجود تمام ارواح درجے میں برابر تھیں؟ نہیں، بلکہ ان میں غیر مسلموں، نافرمانوں، فرمانبرداروں، صدیقین، صالحین، اولیاء، شہداء، انبیاء اور رسولوں کی روحیں بھی ہوں گی اور پھر سب سے اعلیٰ اور ارفع تاجدار کائنات ﷺ کی روح بھی ہوگی۔ معلوم ہوا وہ ساری ارواح مرتبے میں ایک نہیں تھیں۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ مختلف لوگوں کے مراتب میں فرق کی بنیاد علم ہوتا ہے۔ یعنی درجات کی تقسیم علم کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں بھی درجات کی تقسیم کی بنیاد علم ہے۔ جو علم میں جتنا زیادہ ہے، اس کو اللہ نے اتنی فضیلت عطا کردی۔ جیسے نبی پر رسول کا علم زیادہ ہے، اس لیے رسول کو ہر نبی پر فضیلت عطا کردی۔

عالمِ ارواح میں بھی جب تمام ارواح **الست بربکم** کے کلمات سماع کررہی تھیں اور اس کا جواب دے رہی تھیں تو وہاں بھی اللہ رب العزت کے بارے میں تمام ارواح کا علم اور معرفت ایک جیسی نہ تھی۔ کسی کی معرفت اللہ کے بارے میں زیادہ ہے تو کسی کی کم ہے۔ جس کی معرفت اللہ کے بارے میں جتنی زیادہ تھی وہ عالمِ ارواح میں اتنے درجے بلند مقام پر فائز تھا اور اس کے مطابق اللہ رب العزت کے سوال ''**الست بربکم**'' کا جواب دے رہا تھا۔

مثلاً: اگر کوئی سائنس دان کسی شخص سے پوچھے کہ کیا تم مجھے مانتے ہو؟ تو وہ شخص جب یہ جواب دے گا کہ ہاں، جانتا ہوں تو اس جواب کو دیتے ہوئے اس کی نگاہ میں صرف اس کی سائنسی تحقیقات ہوں گی اور وہ اس کے صرف اس پہلو کو جانتا ہوگا اور اسی کو نگاہ میں رکھ کر کہے گا کہ ہاں میں تجھے جانتا ہوں۔ اس موقع پر وہ اس کی زندگی کے دیگر معاملات و معمولات کو نہ جاننے کے باعث صرف اس کی سائنسی خدمات کے حوالے سے اس کو ماننے اور جاننے کا اقرار کرے گا۔

بلاتشبیہ و بلامثال اللہ رب العزت کا تمام ارواح سے سوال بھی مطلق ہے کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ یعنی کیا تم مجھے مانتے ہو؟ اب جواب دینے والا جتنا جانتا ہے، اتنا ہی مانے گا۔ ظاہر ہے کہ تمام ارواح اللہ رب العزت کے بارے میں علم میں برابر نہ تھیں، کسی پر اللہ کی صفتِ رزاقیت واضح تھی تو اس نے جب ''بلیٰ'' کہا تو اس وقت وہ اللہ کا صرف رزاق ہونا جانتا تھا۔۔۔ کسی پر اللہ کی شان علیمی عیاں تھی تو اس نے جب ''بلیٰ'' کہا تو اس وقت اس کو بس یہی علم تھا کہ مولیٰ علیم ہے۔۔۔ کسی پر اس کی صفتِ خبیری عیاں تھی تو اس نے جب ''بلیٰ'' کہا تو

اس قت اس کی نگاہ میں اس کی شانِ خبیری عیاں تھی۔۔۔کسی پر اس کی صفتِ شافی عیاں تھی تو اس نے جب بلیٰ کہا تو اس کی نگاہ میں اس کا شفا دینا تھا۔۔۔کسی پر خدا کا رحیم و کریم ہونا عیاں تھا تو اس نے جب "بلیٰ" کہا تو اس پر اس کی یہی شان عیاں تھی۔ الغرض جتنی ارواح تھیں اور جس جس پر اللہ کی جو جو شان عیاں تھی تو اس نے اس کے مطابق اس پر "بلیٰ" کہہ دیا۔ کسی پر ایک شان عیاں تھی تو اس نے اس پر "بلیٰ" کہا، کسی پر اس کی دو شانیں عیاں تھیں تو اس نے اس پر "بلیٰ" کہا اور کسی پر اس کی دس شانیں عیاں تھیں تو اس سے اس پر "بلیٰ" کہا۔ پس اپنے اپنے علم اور مرتبے کے مطابق حاصل معرفتِ شانِ الٰہی کے جواب میں ہر ایک نے "بلیٰ" کہا۔

ان ارواح میں سے ایک روح تاجدار کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بھی تھی جو اللہ کو اس کی ہر شان سے جانتی اور پہچانتی تھی۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر اللہ کی ہر شان عیاں تھی۔ جب میرے مصطفیٰ ﷺ کی روح مبارک نے "بلیٰ" کہا تو انہوں نے اللہ کی ہر شان اور ہر معرفت کو "بلیٰ" کہا۔ کیونکہ جب وہ "بلیٰ" کہہ رہے تھے تو اس وقت آپ ﷺ پر خدا کی صفتِ رزاقیت بھی عیاں تھی، اس کا کریم ہونا بھی عیاں تھا، اس کا شافی ہونا بھی عیاں تھا، اس کا علیم و خبیر ہونا بھی عیاں تھا، اس کا زندگی اور موت دینا بھی عیاں تھا۔ الغرض جس پر جتنی شانیں عیاں تھیں اس کا "بلیٰ" اتنا جامع تھا اور اس نے اللہ کی معرفت کو سامنے رکھ کر بلیٰ کہا کہ مولا ہاں تو میرا رب ہے اور میں ان سب شانوں کے ساتھ تجھے مانتا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو آپ ﷺ اللہ رب العزت کی تمام شانوں کے مظہرِ اتم بن کر تشریف لائے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی تمام شانوں کی معرفت کے حامل تھے۔ جب آپ ﷺ نے عالم ارواح میں بلیٰ کہا تھا تو مراد یہ کہ آپ سب جانتے تھے۔ اللہ رب العزت کا یہ فرمان بھی آپ ﷺ کی وسعتِ علم کا اظہار ہے:

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ.

"اے حبیبِ مکرم ﷺ ہم نے آپ کو ہر وہ چیز سکھا دی جو آپ نہیں جانتے تھے"۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضور نبی اکرم ﷺ چونکہ سب سے زیادہ جانتے تھے اور جانتے ہیں، اس لیے اللہ رب العزت نے نہ صرف تمام مخلوق میں سب سے بلند مرتبہ آقا ﷺ کو عطا فرمادیا بلکہ جو کرم اور انعام اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کی ذات بابرکات پر فرمایا، وہ کسی اور پر نہ فرمایا۔

سیدنا آدم ﷺ کو آب و گل سے پیدا کیا اور تاجدارِ کائنات کو اپنے نور سے پیدا کیا اور پھر فضیلتیں بھی ایسی دیں جیسی کسی اور کو نہ ملیں۔ آقا ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا اور یہ شان کسی اور کو عطا نہ کی۔۔۔سیدنا آدم ﷺ کو اپنی بارگاہ میں رکھ کر زمین پر بھیج دیا جبکہ تاجدار کائنات ﷺ کو زمین سے بلا کر اپنا دیدار کرادیا۔۔۔ وہ سیدنا ادریس ﷺ پر کرم فرماتا ہے تو ان کو لوح وقلم کا علم عطا کرتا ہے مگر تاجدارِ کائنات ﷺ کو لوح و قلم عطا فرمادیتا ہے کہ آپ ﷺ تقدیریں لکھیں یعنی کسی کو صرف علم دیتا ہے اور کسی کو اس کی ملکیت دے دیتا ہے۔۔۔ سیدنا نوح ﷺ کو یہ شان دی کہ انہوں نے کشتی کے ذریعے اپنے چند لوگوں کو بچایا، مگر تاجدار کائنات ﷺ کو یہ شان دی کہ آپ ﷺ نے ارب ہا انسانیت کو دوزخ کی آگ سے بچایا۔ یعنی بات چند لوگوں تک محدود نہ رکھی۔۔۔ سیدنا ابراہیم ﷺ کو اپنا خلیل بنایا تو آقا ﷺ کو اپنا محبوب بنایا۔۔۔ سیدنا ابراہیم ﷺ نے دعا کی کہ میرے مولا لوگوں میں میرا ذکر بلند کردے جبکہ اپنے محبوب کے لیے خود فرمایا "ورفعنا لك ذكرك"۔۔۔ سیدنا ابراہیم ﷺ کو آگِ نمرود میں ڈلوایا تو نمرود کی لگوائی آگ ٹھنڈی کردی اور یہاں پر اپنے محبوب ﷺ کی امت کو یہ شان دے دی کہ دوزخ کی آگ ان پر ٹھنڈی ہوجائے گی۔۔۔ سیدنا موسیٰ ﷺ کو اللہ رب العزت نے شانِ کلیمی عطا کی مگر اپنے حبیب ﷺ کو اپنا دیدار بھی عطا فرمادیا۔۔۔ موسیٰ ﷺ کو یدِ بیضاء عطا فرمایا تو اپنے محبوب کو ایسا جسد عطا کیا کہ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ اندھیرے میں آپ ﷺ کا پورا جسمِ اطہر چمکتا تھا اور اندھیرا چھٹ جاتا تھا۔۔۔ سیدنا یوسف ﷺ کو ایسا حُسن عطا فرمایا کہ جس پر چند زنانِ مصر مر مٹ گئی تھیں، جبکہ میرے

مصطفیٰ ﷺ کا حُسن یہ تھا کہ یہاں ارب ہا امت آپ ﷺ کے عشاق اور دیوانے آپ ﷺ پر صبح شام بن دیکھے مرتے ہیں۔۔۔ سیدنا یوسف ؑ کو مصر کے خزانوں کی چابیاں عطا کردیں جبکہ اپنے حبیب ﷺ کو زمین کے سارے خزانے عطا فرمادیئے۔۔۔ سیدنا داؤد ؑ کو وہ ہاتھ دیئے جن میں لوہا پگھل جاتا تھا جبکہ میرے مصطفیٰ ﷺ کو وہ دستِ مبارک دیئے جن میں لوگوں کے پتھروں سے بھی سخت دل پگھل جاتے اور وہ حضور ﷺ پر قربان ہو جاتے۔۔۔ سیدنا سلیمان ؑ کو طئی زمانی اور مسافت کی طاقت دی کہ تھوڑے عرصے میں زیادہ کائنات دیکھ لیتے تھے جبکہ یہاں اپنے حبیب ﷺ کے غلاموں کو بھی وہ طاقت دے رکھی ہے کہ حضور سیدنا غوث الاعظمؓ فرماتے ہیں کہ میں دنیا کو اپنی ہتھیلی پر ایسے دیکھتا ہوں جیسے رائی کا دانہ ہو۔۔۔ موسیٰ ؑ نے کہا کہ ''**ربی اشرح لی صدری**'' یہاں اپنے محبوب کو خدا خود کہتا ہے ''**الم نشرح لك صدرك**''۔۔۔

سیدنا عیسیٰ ؑ چند مُردوں کو زندہ فرماتے تھے جبکہ حضور ﷺ نے قیامت تک کھرب ہا لوگوں کے دل زندہ فرمادیئے۔۔۔ سیدنا موسیٰ ؑ کے عصا سے بارہ چشمے رواں ہوئے تھے جبکہ یہاں حضور ﷺ کی انگشتانِ مبارک سے ہزاروں چشمے رواں ہوئے۔

حضور ﷺ مظہرِ صفاتِ الٰہیہ ہیں

اللہ رب العزت نے آقا ؑ کو کثیر شانیں عطا کیں اور اپنی صفات کا رنگ بھی عطا کیا۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ جیسے سامنے دیکھتے تھے، ویسے پیچھے دیکھتے تھے کیونکہ اللہ کی ہر صفت پر بلیٰ کہا تھا لہذا اس کی اس صفت کا رنگ بھی آپ ﷺ میں موجود تھا۔۔۔ اللہ رب العزت کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ آقا ؑ کی شانِ مظہریت کا عالم دیکھئے کہ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جب آرام فرماتے تو آپ ﷺ کی خبر گیری کا عالم جتنا جاگنے کی صورت میں تھا، اتنا سوتے میں بھی تھا۔۔۔ اللہ حیا دار ہے۔ حضور ﷺ کی ذات میں اللہ کی اس صفت کا فیض دیکھئے کہ صحابہ کرامؓ بیان فرماتے ہیں کہ آقا جیسا حیا دار ہم نے کسی کو نہ دیکھا تھا۔۔۔ خدا سخی اور غنی ہے۔ آقا ؑ کے بارے میں صحابہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اتنے غنی تھے اور اتنا عطا فرماتے کہ فقر کا خیال تک نہ آتا اور ہر کسی کی جھولیاں بھر بھر کے بھیجتے تھے۔۔۔ اسی طرح اللہ کی ایک شانِ تخلیق بھی ہے اور حضور ﷺ اُس کی اس شان کا بھی مظہر تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی کی تلوار ٹوٹ گئی۔ آپ ﷺ نے اُسے درخت کی شاخ (ٹہنی) عطا فرمائی کہ جاؤ اس کے ساتھ لڑو۔ وہ صحابی اس ٹہنی کے ساتھ میدان میں کفار سے لڑے اور وہ درخت کی ٹہنی تلوار کی طرح کفار کو کاٹتی چلی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ اقدس سے لکڑی کی ٹہنی کو لوہے کی تلوار بنادیا۔ وہ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے کئی سال اس تلوار کے ساتھ غزوات اور جنگیں لڑیں۔ یہ سب معجزہ نہیں بلکہ آپ ﷺ نے لکڑی کی اصل ہیئت کو بدل کر رکھ دیا، یہ شانِ تخلیق ہے۔۔۔ اسی طرح ایک موقع پر صحابہ کرام حضور ﷺ کی بارگاہ میں پانی کی خالی چھاگل لے آئے جس میں چند قطروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ اقدس چھاگل میں ڈالا تو پانی کے ایسے چشمے رواں ہوئے کہ اس سے ایک ہزار صحابہ سیراب ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی شانِ تخلیقی ہے جس کے مظہر حضور ﷺ بن چکے تھے۔۔۔ کہیں حضور ﷺ تھوڑے سے کھانے میں اپنا لعابِ دہن ڈالتے تو ہزاروں لوگوں کی خوراک کا انتظام ہوجاتا اور کھانے میں اضافہ ہوجاتا۔۔۔ کبھی سیدنا ابی ہریرہؓ کی سترہ کھجوروں کو اپنی توجہ اور خیرات سے اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ جس دن سیدنا عثمان غنیؓ شہید ہوئے، میں نے اس وقت تک اس پوٹلی میں سے اتنی کھجوریں کھائیں اور لوگوں میں تقسیم کیں کہ شاید کئی ٹن بن جائیں۔

یہی وہ علم کے مراتب تھے کہ جب محمد مصطفیٰ ﷺ نے خدا کو ہر شان کے ساتھ مانا اور جانا تو خدا نے بھی آپ ﷺ کو اپنی ہر شان کا مظہر اتم بنادیا۔ یہ وہ شانیں اور عظمتیں ہیں جن کی وجہ سے کائنات میں حضور ﷺ کے چرچے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ

آقا ؑ کے اخلاقِ عالیہ کی بات کی جائے تو آپ ﷺ

اخلاقِ حسنہ کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ بچوں اور گھر والوں پر شفقت فرماتے، آپ کی طبیعت میں مزاح بھی تھا، ہر حال میں صرف حق بات فرماتے، فحش گوئی سے دور تھے، کسی خادم کو کبھی تکلیف نہ دی، اپنی ذاتی وجہ سے کسی سے ناراض نہ ہوتے، جب صحابہ کرامؓ گفتگو فرماتے تو آپ ﷺ ان کے ساتھ شریک ہوجاتے اور جب صحابہ، حضور ﷺ سے بات کرتے تو آپ ﷺ مکمل توجہ سے سنتے، لوگوں کی مشکلات حل کرتے اور ان کی حاجت روائی فرماتے، بازار میں آواز اونچی کرنا پسند نہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، آپ ﷺ تواضع اور بردباری کا پیکر تھے، حضور ﷺ نرم دل تھے، پاکیزہ نفس کے مالک تھے، آپ ﷺ کے اخلاق کامل تھے، شکر گزار تھے، صاحبِ حیا اور پردہ پوشی فرمانے والے تھے۔ آپ ﷺ عباد (بندوں) میں سب سے کامل عبد تھے، عابد بھی ایسے کہ آپ ﷺ کے قدمین مبارک متورم ہوجاتے۔ خدا پر توکل کرنے والے تھے، امت پر شفیق تھے اور امت کو نقصان سے باخبر فرمانے والے تھے۔

آپ ﷺ اتنے کریم اور شفیق تھے کہ انسان تو انسان رہا، جانوروں پر بھی آپ ﷺ کی شفقت عیاں تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ خدا کی ہر شان کے مظہر تھے اور خدا بھی تو مخلوق میں جانوروں کی خبر گیری کرتا ہے، انہیں رزق دیتا ہے اور انہیں تکلیف سے بچاتا ہے۔ کبھی کوئی اونٹ اور کبھی کوئی ہرنی آتی ہے اور اپنی زبان سے مصطفیٰ ﷺ کو کہتی ہے کہ اس شخص نے مجھے قید کیا ہے، میں نے جنگل میں اپنے بچے کو دودھ پلانا ہے۔ قربان جائیں آپ ﷺ کی کمال شفقت پر کہ اس ہرنی کے درد کا بھی احساس فرماتے ہیں اور مالک سے فرماتے ہیں کہ میں اس ہرنی کی گارنٹی دیتا ہوں اور اس کی جگہ میں کھڑا ہوں، اس کو چھوڑ دے تاکہ یہ اپنے بچے کو دودھ پلاکر واپس آجائے۔

محترم قارئین! ایسا کون کرتا ہے کہ جو ایک ہرنی کی صدا پر اپنے آپ کو بطور گارنٹی وہاں پر کھڑا کردے اور ہرنی بھی حضور ﷺ کی گارنٹی کی ایسی لاج رکھتی ہے کہ وہ دودھ پلاکر واپس لوٹ آتی ہے۔ حضور ﷺ کو اس کی ادا اتنی پسند آتی ہے کہ اس کے مالک کو فرماتے ہیں کہ کیا یہ مجھے بیچتے ہو؟ اس نے کہا: حضور، سب آپ کا ہے۔ فرمایا: پھر اسے آزاد کردو اور اس شخص نے اسے آزاد کردیا۔

محترم قارئین! یہ سب کچھ ہم میں بھی ہونا چاہئے کیونکہ ہم حضور ﷺ کے امتی ہیں، مگر افسوس! ہم بردبار نہیں ہیں، ہم شفیق نہیں ہیں، ہم خوش اخلاق نہیں ہیں، ہم محبتیں بانٹنے والے نہیں ہیں بلکہ ہم غصہ کرنے والے، نفرتیں بانٹنے والے، فتوے لگانے والے، قتل کرنے والے اور لوگوں کا جینا اجیرن کرنے والے ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات نہیں ہیں۔ حضور غمگسار تھے، بچوں پر رحم اور بڑوں کی غم گساری فرماتے۔ آج ہمارے پاس اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ ہر وقت دوسروں کی ہم ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ کسی کی کوئی خامی مل جائے تو اس کا دامن چاک کردیں، اس کو معاشرے میں بے عزت کردیں حضور ﷺ ایسے نہیں تھے اور نہ یہ آپ ﷺ کی تعلیمات ہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم آقا ﷺ کی تعلیمات کو حرزِ جاں بنائیں اور حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت وعشق سے اپنے ایمان کو منور کریں۔ آقا ﷺ کی اطاعت و اتباع میں اپنی زندگیاں صرف کریں جس کے بارے میں اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ. (آل عمران، ۳: ۳۱)

''(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف فرما دے گا''۔

ہمیں چاہیے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع کا کامل نمونہ بن جائیں اس لیے کہ اگر حضور ﷺ کی سچی اطاعت کرلیں تو اللہ رب العزت نہ صرف ہمارے گناہ معاف کردے گا بلکہ ہمیں بھی اپنا محبوب بنا لے گا۔ اللہ کا محبوب بننے کا واحد ذریعہ اطاعتِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔ یاد رکھیں! اطاعت، محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ اطاعت و محبتِ رسول ﷺ کو اپنی زندگی کا زیور بنالینا اصل زندگی ہے۔

❁❁❁❁❁

اصلاحِ مریدین

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات کی روشنی میں

تصوف و روحانیت کا تقاضا ہے کہ سالک عبادت و ریاضت اختیار کرے۔ مشاہدہ مجاہدہ کے بغیر میسر نہیں آتا

ڈاکٹر نعیم انور نعمانی

اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شریعت اور طریقت دونوں مشرب باہم لازم وملزوم ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدانہیں کیا جاسکتا۔ شریعت اگر انسان کے ظاہر کو مطیع بناتی ہے تو طریقت انسان کے باطن میں اطاعت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اسلام کے ان دونوں سرچشموں کا مقصد افراد اور معاشرہ کے احوال کی اصلاح ہے۔ حضور غوث الاعظمؒ کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں وہاں شریعت و طریقت کے ان ہی مقاصد کے حوالے سے واضح رہنمائی میسر آتی ہے۔

حضور غوث الاعظمؒ کی تعلیمات اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی اتباع اور احکامِ شریعت کی پیروی پر مبنی ہیں۔ ان تعلیمات میں ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ابتغاء و رضا طلبی کا سبق مضمر ہے۔ یہ تعلیمات احوالِ قلب، احوالِ نفس اور احوالِ روح کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے موافق کرنے کی تعلیمات ہیں۔ نیز یہ ظاہر پر شریعتِ اسلامی کے وجوب اور نفاذ کی تربیت کا سامان بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

ذیل میں اصلاحِ احوال کے لیے حضور غوث الاعظمؒ کی چند تعلیمات نذرِ قارئین کی جارہی ہیں:

سالک اور فقر لازم وملزوم ہیں

روحانیت میں سالک کو وصل کی راہوں پر چلایا جاتا ہے۔ محبت کا تعلق اپنے محبوبِ حقیقی سے فنائیت والا ہو تو پھر وصالِ حقیقی کی لذّتیں ملتی ہیں اور یہ کیفیات تب ملتی ہیں کہ جب سالک مکمل طور پر فقر میں ڈھل جائے۔ حضور غوث الاعظمؒ فرماتے ہیں:

جعلت الفقر والفاقة مطية الانسان فمن ركبها فقد بلغ المنزل قبل ان يقطع المفاوز والبوادى.

(تذکرہ قادریہ، ص:۱۵۳)

''فقر وفاقہ انسان کے لیے سواری بنائی ہے، پس جو کوئی اس پر سوار ہوا، وہ میدان اور وادی قطع کرنے سے پہلے ہی منزل مقصود پر پہنچ گیا''۔

جب محبّ، محبوب کی محبت میں فنا ہوتا ہے تو اسے محبوب کا وصل میسر آتا ہے۔ فرمایا:

فاذا فنى المحب عن محبة وصل بالمحبوب.

''جب محبّ محبوب کی محبت میں فنا ہوتا ہے تو اسے محبوب کا وصل مل جاتا ہے''۔ (تذکرہ قادریہ، ص:۱۵۲)

محبّ جب اپنے محبوب کے ساتھ وصل کا تعلق قائم کرلیتا ہے تو وہ فقر میں ڈھل جاتا ہے اور فقیر کے منصب پر فائز ہوجاتا ہے۔ فرمایا:

الفقير الذى له امر فى كل شيء اذا قال لشيء كن فيكون. (تذکرہ قادریہ، ص:۱۵۴)

''فقیر وہ ہے جس کا حکم تمام چیزوں میں نافذ العمل ہو، جب کسی چیز کو کہے: ہوجا، تو وہ ہوجائے، اس تصرف کا نام فقیری ہے''۔

رب کی حضوری کی کیفیات اس وقت میسر آتی ہیں جب انسان راہِ فقر کا مسافر ہوجائے۔ اس لیے مکاشفاتِ الٰہیہ میں

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے فرمایا گیا:

من اراد منکم جنابی فعلیه باختیار الفقر.

''جو میری حضوری کا ارادہ کرے پس اس پر فقر اختیار کرنا لازم ہے''۔ (تذکرہ قادریہ،ص:۱۵۵)

فقر کی انتہا یہ ہے کہ دل ماسوی اللہ سے خالی ہوجائے۔ دل میں فقط رب رہ جائے اور رب کی یاد اور محبت رہ جائے، اس لیے مکاشفات میں کہا:

من اراد منهم ان یصل الّی فعلیه بالخروج عن کل شیء سوائی. (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۵)

''تم میں سے جو کوئی مجھے ملنے کا ارادہ رکھے پس اس پر لازم ہے کہ میرے سوا تمام کا خیال دل سے نکال دے''۔

بندے کو فقر، وصل، محبیت اور محبوبیت کے مقامات تب ملتے ہیں، جب وہ اپنے اندر عاجزی و انکساری کی کیفیات اور عادت کو پیدا کرلے۔ اس لیے مکاشفات میں یہ راز شیخ عبدالقادر جیلانی سے بیان کیا گیا:

العجز منبع الانوار والعجب منبع الظلمة. (تذکرہ قادریہ، ص:۱۵۹)

''عاجزی انوار کا خزانہ ہے اور تکبر اندھیروں کا سرچشمہ ہے''۔

بندگی سراسر عاجزی اور انکساری کا نام ہے اور تکبر اور غرور شانِ بندگی کے خلاف ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

وما تواضع احد لله الا رفعه الله.

''جس نے اللہ کی خاطر عاجزی و انکساری کی، اللہ اس کو سربلند کردے گا''۔ (امام مسلم، الصحیح)

روحانیت میں مجاہدہ مشاہدے کے لیے لازم ہے

تصوف و روحانیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک سالک عبادت و ریاضت اور مشقت و مجاہدہ کو اختیار کرکے مشاہدہ کی منزل کو حاصل کرلے لیکن مشاہدہ، مجاہدہ کے بغیر میسر نہیں آتا۔

المجاهدة بحر من مشاهدة. (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۲)

''مجاہدہ مشاہدے کا سمندر ہے''۔

فمن اراد الدخول فی بحر المشاهدة فعلیه باختیار المجاهدة. (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۲)

''جو کوئی مشاہدے کے سمندر میں داخل ہونے کا ارادہ کرے، اس پر لازم ہے کہ وہ مجاہدے کو اختیار کرے''۔

اس لیے جو طالبانِ حق ہیں ان کے لیے مجاہدہ ضروری ہے۔

لا بدللطالبین من المجاهدة. (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۳)

''طالبانِ حق کے لیے مجاہدہ کے بغیر کوئی چارہ نہیں''۔

معرفتِ خداوندی کیلئے حصولِ علم ضروری ہے

مجاہدے کی منزل ہو یا مشاہدے کا مقام، ان دونوں کا حصول ایک سالک کے لیے صرف اور صرف علمِ حقیقی کے حصول کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے اور اگر علم ترک کردیا جائے تو انسان شیطنت اور مکروفریب کی راہ پر چلا جاتا ہے جو اس کو رحمٰن سے دور کردیتا ہے اور وہ نتیجتاً شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

لو ترك العلم عنده صار شیطانا.

''اگر اللہ کی معرفت میں علم کو ترک کردیا جائے تو انسان شیطان بن جاتا ہے''۔ (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۱)

عالم جب مولا کے حضور پیش ہو تو پھر وہ اپنے علم کا زعم نہ کرے۔ مولا کے سامنے آئے تو لاعلم ہونے کا اظہار کرے اور اس کی زبان پر یہ کلمات ہوں:

لیس لصاحب العلم عندی سبیل الا بعد انکاره.

''صاحبِ علم کا میرے نزدیک کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنے علم کا انکار کرکے آئے''۔ (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۱)

اس لیے علم کی انتہا یہی ہے کہ ہر چیز جان کر انسان یہی کہے کہ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

علم العلم هو الجهل عن العلم. (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۴)

''علموں کا علم تمام علموں سے لاعلمی ہے''۔

سالک وہ ہے جسے اپنے علم پر ناز نہ ہو بلکہ مزید جاننے کی آرزو ہو اور اس کا علم اللہ کی معرفت میں رکاوٹ نہ بنے۔

طاعت اور معصیت بھی ایک حجاب ہے

راہِ سلوک میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ جب سالک اطاعت گزار ہوتا ہے تو وہ اطاعت اس کے لیے حجاب بن جاتی ہے اور اگر سالک گنہگار ہے تو معصیت اس کے لیے حجاب بن جاتی ہے۔ اس لیے مکاشفات میں آپ کو فرمایا جاتا ہے:

اهل المعاصی محجوبون للمعاصی واهل الطاعات محجوبون بالطاعات

(تذکرہ قادریہ،ص:۱۵۹)

''گنہگار گناہوں کے باعث اور پرہیزگار طاعت وعبادت کی وجہ سے مجھ سے محجوب ہیں اور میری دید سے محروم ہیں''۔

اس حجاب کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں اہلِ طاعت ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتے رہتے ہیں جبکہ اہلِ عصیاں گناہ کرنے کے بعد ہر وقت مغفرت مانگتے رہتے ہیں۔ اللہ کی ذات تک پہنچنے میں اہلِ طاعت کے لیے نعمتوں میں مشغول ہونا رکاوٹ بن جاتا ہے اور اہلِ معصیت کا گناہ کرکے معافی طلبی میں لگے رہنا، رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یوں اس کی ذات تک دونوں نہیں پہنچ پاتے، اس لیے مکاشفات میں فرماتے ہیں:

اھل الطاعات یذکرون النعیم

واھل العصیان یذکرون الرحیم

''نیکوکار ہر وقت نعمتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور گنہگار ہر وقت رحمت ومغفرت کو طلب کرتے ہیں''۔ (تذکرہ قادریہ،ص:۱۵۹)

گنہگاروں اور طاعت گزاروں کے حجابات

سالک کا مقصود اس کے حسنِ مطلق کو دیکھنا اور ہمہ وقت اس کی طرف متوجہ رہنا تھا مگر سالک اس نورِ حق کے مشاہدہ کی طرف راغب نہ ہوا اور نہ ہی اس میں اس نورِ ازل کے مشاہدے کی صلاحیت تھی۔ یہ سالک اس نورِ سرمدی کے جلوؤں کو اپنے اندر سمانے کے لیے متوجہ نہ ہوا اور نہ ہی وہ اس صلاحیت کا حامل ٹھہرا جس کی بناء پر بندہ عام و خاص، ظلمت کے حجابات میں گرفتار ہوگیا اس لیے مکاشفات میں فرمایا گیا:

خلقت العوام فلم یطیقوا نور بھا فجعلت بین وبینھم حجاب الظلمۃ وخلقت الخواص فلم یطیقوا مجاورتی فجعلت الانوار بینی وبینھم حجابا.

''میں نے عام لوگوں کو پیدا کیا جب وہ میرے نور کی روشنی برداشت نہ کرسکے تو میں نے اپنے اور ان کے درمیان تاریکی کا پردہ بنادیا اور جب خاص لوگوں کو پیدا کیا تو انہوں نے میری نزدیکی برداشت نہ کی تو میں نے اپنے اور ان کے درمیان انوار کا پردہ بنادیا''۔ (تذکرہ قادریہ،ص:۱۴۰)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی معرفت وقربت تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنے بشری وجود کو طاعات وعبادات کے اعمال بجا لاکر اسے نوری وجود بنانا ہوگا۔ جس قدر طاعات وعبادات کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا تو توں توں ہمارے بشری وجود کی کثافتیں ماند پڑتی جائیں گی اور نوری کیفیتیں اس جلوۂ حق کو اپنا مسکن بنالیں گی۔ پھر حجابات مرتفع ہوجائیں گے اور **نور علی النور** ذات کی دید کے لیے وجود نوری ہوجائے گا۔ یہ موافقت ہی وصل کی منزل تک لے جائے گی۔

ہمارے لیے حجابات ہمارے نفس کے گناہ ہیں، ہماری شب و روز کی نافرمانیاں ہیں اور ہمارے نفس کا ہر لحہ معصیت کے لیے کوشاں رہنا ہے۔ ہمارے نفس پر خیر کا نہیں بلکہ شر کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ نفس نیکی سے دور اور برائی کے قریب ہوتا ہے لہذا یہ برائی کی طرف فوری آمادہ ہوتا ہے۔ خیر کی طرف اس کے قدم فوری نہیں اٹھتے ہیں۔ اس نفس میں گناہوں کا یہ میلان اور گناہوں سے اس قدر دلچسپیاں اور گناہوں میں لت پت ہونے کا یہ رجحان اس نفس کو قربت ومعصیت اور معرفت کی وادی میں داخل نہیں ہونے دیتا۔

سالک کے لیے توبہ فرض ہے

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مکاشفے کے ذریعے اپنے مریدوں کی اصلاح یوں کرتے ہیں کہ تمہارے لیے گناہوں سے توبہ کرنا انتہائی ضروری ہے اور توبہ یہ ہے کہ تمہارا وجود گناہ سے پاک ہوجائے اور معصیت کو کلیتًا ترک کردے۔ مکاشفے میں باری تعالیٰ یوں مخاطب ہوتا ہے:

اذا اردت التوبہ فعلیک باخراجھم الذنب عن النفس ثم باخراج الخطرات من القلب تصل الی.

''جب تو توبہ کا ارادہ کرے پس تجھے چاہیے کہ گناہوں کا خیال و ارادہ وجود سے نکال دے، پھر وسوسوں کو دل سے نکال کر مجھ سے واصل ہوجا''۔ (تذکرہ قادریہ،ص:۱۶۲)

توبہ کیا ہے اور توبہ کی حقیقت کیا ہے؟ بہت خوبصورت انداز میں اس مکاشفے میں اس کو واضح کیا گیا ہے۔ یعنی توبہ نفس سے گناہ اور ارادۂ گناہ کو ختم کرنے کا نام ہے۔ اگر ہماری ایسی توبہ ہوجائے تو ہمارے احوالِ حیات سنور جائیں، بسا

اوقات جب ہم نیکی کی راہ پر چلتے ہیں تو ہمارا نفس اس وقت جہاں نیکی کے ماحول میں رہتا ہے تو اس پر شیطانی حملے بھی زیادہ ہوجاتے ہیں، ہم اس وقت کسی کام کو نیکی سمجھ کر کر رہے ہوتے ہیں جبکہ دوسروں کی نگاہوں میں ہمارا وہی کام عملِ بدی و برائی ہوتا ہے۔ انسان ہر بدی سے، ہر شر سے اور ہر فتنے سے خود کو بچاتا ہے۔ صدقِ دل سے ادا کیے جانے والا انسان کا یہی عمل اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ بن جاتا ہے۔

پس بندہ جب ''**اخراج الذنب عن النفس**'' گناہوں کو وجود سے نکالنے والا اور ''**اخراج الخطرات من القلب**'' دل سے وساوس اور گناہ کو مٹانے والا بن جاتا ہے تو اب اس کی توبہ کو یہ مقام حاصل ہوجاتا ہے جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ. (ابن ماجہ، السنن، کتاب الزہد، باب ذکر التوبہ، ۲: ۱۴۱۹، رقم ۴۲۵۰)

''گناہ سے سچی توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو''۔

توبہ وصلِ حق کے قابل بناتی ہے

جب انسان کا نفس گناہ اور ارادۂ گناہ سے پاک ہوجاتا ہے تو یہی نفسِ امارہ پھر نفسِ مطمئنہ، نفسِ راضیہ اور نفسِ مرضیہ بن جاتا ہے۔ جب انسانی نفس اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو اللہ کی بارگاہ سے یہ ندا آتی ہے:

یٰٓـاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ. ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً. فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰـدِیْ. وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ.

''اے اطمینان پا جانے والے نفس! تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور اس کی رضا کا مطلوب بھی (گویا اس کی رضا تیری مطلوب ہو اور تیری رضا اس کی مطلوب)۔ پس تو میرے (کامل) بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنتِ (قربت و دیدار) میں داخل ہو جا''۔ (الفجر، ۸۹: ۲۷ تا ۳۰)

نفس کا یہی مقام، مقامِ وصل ہے، جب بندہ خود کو طاعت وعبادت کے نور سے اس قابل بنالیتا ہے کہ اب اسے وصل کی کیفیات ملیں، اب اس کے سارے حجابات اٹھا دیئے جائیں۔ اس لیے کہ اب اس بندے نے فنا فی اللہ کا سفر طے کرکے خود کو اس قابل بنالیا ہے کہ اس نورِ حق، نورِ سرمدی اور اس حسنِ مطلق کو دیکھ سکے۔ اس لیے کہ اس کا ظاہر و باطن مولا کے علاوہ ہر چیز سے خالی ہوچکا ہے۔

اس لیے مکاشفات میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے فرمایا گیا:

من اراد منھم ان یصل الی فعلیہ بالخروج عن کل شیء سوائی. (تذکرہ قادریہ، ص: ۱۶۲)

''تم میں سے جو کوئی مجھے ملنے کا ارادہ کرے، پس اس پر لازم ہے کہ میرے سوا تمام کا خیال دل سے نکال دے''۔

اب بندۂ مؤمن کا قلب و روح مولا کی یاد میں رہتا ہے، قلب سے ہر خیال و گمان نکل گیا ہے۔ اب اس قلب میں رب کے ڈیرے ہیں، اس قلب کو اس نے اپنا مسکن بنالیا ہے اور یہ دل اس کے بسنے سے **نور علی نور** ہوگیا ہے۔ اب یہ قلب اپنی قربت میں بیٹھنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اپنا نور اور اپنا فیض دوسروں کے دلوں تک پہنچاتا ہے۔ جب دلوں میں یوں موافقت و موانست پیدا ہوتی ہے تو یہ دل آپس میں اکٹھے کردیئے جاتے ہیں۔ دلوں کے اس اکٹھے ہونے کے عمل کو وصل کہتے ہیں۔ وصلِ یار کے لیے سب کو اپنے نفوسِ امارہ سے جدائی و فصل کرنا ہے۔ وصل کی نعمت دنیا کی نعمتوں اور تعیّشات کے فصل کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ کی عبادت و معرفت میں انسان کے لیے وصل ہی اصل العبادت ہے۔

انسان اس وصل کا طالب ہوتا ہے مگر صدقِ دل سے نہیں ہوتا اور صدقِ دل سے طالب ہونا یہ ہے کہ بندے کی نماز کبھی بھی نہ چھوٹے۔ بندہ اپنی زندگی میں نماز سے کبھی دور نہ ہو۔ نماز انسان کے لیے وصل بنتی ہے اور یہ وصل ہمیں نماز کی نعمتِ معراج تک لے جاتا ہے۔ اس لیے مکاشفہ میں فرمایا:

المحروم عن الصلوٰۃ ھو المحروم عن المعراج عندی. (تذکرہ قادریہ، ص: ۱۶۴)

''جو نماز سے محروم ہے، وہ میرے نزدیک اپنی زندگی اور اپنے مولا کے تعلقِ بندگی کی معراج سے بھی محروم ہے''۔

مریدوں کیلئے شیخ کی روحانی سرپرستی

وہ مرید جو صحیح معنوں میں تعلیماتِ غوثیہ پر عمل پیرا

ہوجاتا ہے اور شاہِ جیلانؒ کی روحانی ہدایات کو اپنا عمل بنا لیتا ہے اور خود کو فنائے مرشد کرلیتا ہے تو ایسے مرید کو شاہِ جیلانؒ یوں مخاطب کرتے ہوئے خوشخبری دیتے ہیں:

وعزة اللّٰہ وان یدی علی مریدی کالسماء علی الارض اذ لم یکن مریدی جیدا فانا جید.

''مجھے اللہ کی عزت و جلالت کی قسم! میرا ہاتھ اپنے مریدوں پر اس طرح ہے جس طرح زمین پر آسمان کا سایہ ہے۔ اگر میرا مرید عالی مرتبہ نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، میں تو اللہ کی بارگاہ میں عالی مرتبہ ہوں''۔ (بہجۃ الاسرار، ص:۱۰۰)

☆ آپؒ نے جس کو اپنی نسبت دی ہے اور جس کو اپنا مرید کہا ہے، آپؒ نے اس مرید کی محنت و ریاضت اور عبادت و مجاہدہ کا منظر یوں کھینچا ہے:

رجالی فی ھوا جرھم صیام وفی ظلم اللیالی کاللالی

(تذکرہ قادریہ، ص:۳۳۱)

''میرے مرید موسم گرما میں بھی روزے رکھتے ہیں اور رات کی تاریکی میں عبادت کی روشنی سے موتیوں کی طرح چمکتے ہیں''۔

اس لیے اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مریدی ھم وطب واشطح و غنی وافعل ماتشاء فالاسم عالی

''اے میرے مرید! سرشارِ عشقِ الٰہی ہو، خوش رہ اور بے باک ہو اور خوشی کے نغمے گا اور اطاعت میں جو چاہے کر کیونکہ میرا نام بلند ہے''۔ (تذکرہ قادریہ، ص:۳۳۰)

☆اس سے بھی بڑھ کر ایک مرید کو یہ مژدہ جانفزا سناتے ہیں:

مریدی لا تخف اللّٰہ ربی عطانی رفعة نلت المنالی

''اے میرے مرید! کسی سے مت ڈر، اللہ میرا پروردگار ہے اس نے مجھے وہ بلندی عطا فرمائی ہے کہ جس سے میں نے اپنی مطلوبہ آرزو کو پالیا ہے''۔ (تذکرہ قادریہ، ص:۳۳۰)

☆ اس لیے فرماتے ہیں:

بلاد اللّٰہ ملکی تحت حکمی.

''اللہ تبارک و تعالیٰ کے تمام شہر میرا ملک ہیں اور ان پر میری حکومت جاری ہے''۔ (تذکرہ قادریہ، ص:۳۳۰)

☆ ان شہروں اور ان ملکوں میں آپ کی روحانی حکومت کس طرح جاری و ساری ہے اس حقیقت کو بھی یوں واضح کیا:

نظرت الی بلاد اللّٰہ جمعاً کخردلة علی حکم التصالی

''اللہ تبارک و تعالیٰ کے تمام شہروں کو اس طرح دیکھتا ہوں جیسے رائی کا دانہ ہو اور میرا حکم اتصال جاری ہے۔

ولانی علی الاقطاب جمعا فحکمی نافذ فی کل حال

''اللہ تعالیٰ نے مجھے جملہ اقطاب پر حاکم بنایا ہے پس میرا حکم ہر حال میں جاری و ساری ہے''۔

خلاصہ کلام

تصوف و سلوک، روحانیت و احسان اور طریقت و حقیقت کی دنیا میں جسے مرید کہا جاتا ہے وہ مرید تب بنتا ہے جب وہ ''من اراد'' کی کیفیت میں ڈھلتا ہے۔ مرید ''من اراد'' میں اپنا ارادہ، اللہ کی معرفت کا کرتا ہے، اس کا ارادہ، رب کی قربت، توحید کی پہچان، اللہ کو معبود حقیقی جاننا اور سمجھنا، اسے اپنا خالق و مالک، رازق، شافی، داتا و مولا، ہر چیز پر قادر اور ہر شے سے زیادہ طاقتور جاننے کا ہوتا ہے۔ وہ مرید اپنے شیخ کی تعلیم و تربیت کے ذریعے توحید کی معرفت بھی حاصل کرتا ہے اور مقامِ رسالت کا فہم بھی حاصل کرتا ہے۔۔۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت بھی سیکھتا ہے اور قربت کی لذّت بھی پاتا ہے۔۔۔ مرید کا ارادہ اللہ، اس کے رسول ﷺ، اس کے دین کی معرفت اور دینِ اسلام کے فروغ و اشاعت کی خدمت سے استوار ہوتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے تعلق میں استقامت اور دین کی تعلیمات کو معاشرے میں فروغ دینے پر ثابت قدمی کا نام ہی پیری مریدی ہے اور یہی کام ایک مرشد اور مرید کا فرضِ اولین ہے۔

تصوف و سلوک دین کی تعلیمات کو ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن میں بھی مضبوط و مستحکم کرنے کا نام ہے تاکہ دینی اقدار کی ظاہر داری ان کی باطنی استواری کے ذریعے مضبوط و مستحکم ہوجائے۔

تعلیماتِ غوثیہ میں صبر اور رضا بالقضا کا تصور

اللہ کے مقربِ خاص کی علامات اذیت رسانی پر صبر اور معاف کرنا ہے

ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی

انسان کو جسمانی چوٹ لگے یا ذہنی صدمہ پہنچے، اس کا تڑپ اٹھنا اور بے تاب ہوجانا ایک طبعی امر ہے۔ کوئی کیسا ہی صبر وتحمل والا یا حکمت و دانش والا ہو، تکلیف پہنچنے پر اُس کا بے ساختہ ردِعمل ظاہر ہوکر رہے گا۔ وہ جتنا چاہے اپنے دکھ درد اور کرب پر قابو پالے، اُس کے چہرے سے اندرونی کیفیت کا اظہار ہوہی جائے گا، مگر جو سعادت مند انسان اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے خالق اور اُس کے نظام کی پہچان حاصل کرلیتا ہے، اُس کا الگ ہی رنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے رب کی محبت سے سرشار ہوکر جہاں اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے، وہیں اپنے رب کی طرف سے حکمت اور رحمت پر مبنی تکالیف کا بھی خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔ اُس کے لیے رب کی رضا ہر چیز پر مقدم ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے رب کی رضا کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتا ہے کہ اُسے کوئی تکلیف بے صبری پر نہیں ابھار سکتی۔ وہ دکھ درد اور کرب کے لمحوں میں بھی مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے۔ ایسے سراپا تسلیم و رضا لوگوں کو اپنے رب کی معیت حاصل ہوجاتی ہے۔

قطبِ ربانی، غوثِ صمدانی سیدی الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے زمانۂ طالب علمی میں بہت کٹھن حالات دیکھے، بہت مشقتیں اٹھائیں، انتہا درجے کی لذتِ فاقہ مستی بھی دیکھی مگر آپ کی ثابت قدمی میں کبھی کوئی لغزش واقع نہ ہوئی اور نہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر آیا۔ ظاہری مصائب و مشکلات سے صبر و شکر اور تسلیم و رضا کے پیکر بن کر گزرنے کے بعد آپ اُس مرتبہ و مقام پر فائز ہوئے جہاں کبار اولیاء نے آپؒ کے مبارک قدم کے احترام میں گردنیں خم کردیں۔

آزمائش و ابتلاء کی ناگزیریت

حضرت غوث اعظمؒ نے اپنے ایک خطبہ میں اولیاء کے لیے آزمائش اور ابتلاء کی ناگزیریت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''آزمائش اور ابتلاء خاص طور پر ولایت کے دعویداروں کے لیے لازمی امر ہیں۔ اگر آزمائش اور ابتلاء کا سلسلہ نہ ہوتا تو بہت لوگ ولایت کا دعویٰ کرتے۔ اسی لیے بعض صالحین نے فرمایا ہے:

کُلَّ الْبَلآءُ بالولایۃ کی لاتدعی.

''ولایت کو آزمائش اور ابتلاء سے مربوط کیا گیا ہے تاکہ تو ولایت کا دعویٰ نہ کرے''۔

اور ولی کی علامات میں سے نمایاں علامت اس کا مخلوق کی اذیت رسانی پر صبر کرنا اور اذیت رسانی کرنے والوں کو معاف کرنا ہے۔ وہ مخلوق کی بدسلوکی دیکھتے ہوئے اسے نظر انداز کردیتے ہیں، اُن سے اذیت کے کلمات سن کر بھی اُن کلمات کو ذہن سے نکال دیتے ہیں۔ وہ اپنی عزتیں لوگوں کو پیش کردیتے ہیں۔ کہا گیا ہے:

حبّکَ للشّیءَ یُعْمی ویصم.

''کسی چیز سے تمہاری محبت تمہیں اندھا اور بہرا کردیتی ہے''۔

اولیاء نے اللہ تعالیٰ سے یوں لامحدود محبت کی ہے کہ وہ غیر اللہ سے اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں۔ وہ مخلوق کے ساتھ نرمی اور مروّت سے ملتے ہیں مگر کبھی کبھار اُن (کو معصیت میں مبتلا دیکھ کر) پر ناراض بھی ہوتے ہیں، اس طرح وہ اللہ کے غضب میں اُس کی پیروی بھی کرتے ہیں‘‘۔

(سید عبدالقادر جیلانی، الفتح الربانی والفیض الرحمانی، ص:۱۷۹)

حضرت غوث اعظمؒ ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں:

المومن یثبت عندہ ان اللہ عزوجل مایبتلیہ بشیء الا لمصلحۃ تعقب ذلک، اما دنیا او آخرۃ، فھو راض بالبلاء وصابر علیہ، غیر متھم ربہ عزوجل، شغلہ ربہ عزوجل عن البلاء. (ایضاً، ص:۳۲)

’’بندۂ مومن کو یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے کسی مصلحت کے بغیر کسی تکلیف میں مبتلا نہیں فرماتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آزمائش پر صابر اور ثابت قدم رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بے صبری پر مشتمل کوئی بات نہیں کہتا۔ اُسے اُس کے رب نے تکلیفوں سے بے پرواہ کردیا ہے‘‘۔

صبر اور رضا بالقضاء کے ثمرات

بندۂ مومن کے آزمائش اور ابتلاء پر صبر اور رضا بالقضا کے ثمرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں:

’’جب بندۂ مومن کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے پہلے تو خود ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اگر وہ اس مصیبت سے نجات حاصل نہ کر پائے تو وہ مخلوق سے مدد طلب کرتا ہے، جیسے سلاطین، اعلیٰ مناصب پر فائز شخصیات، اصحابِ احوال اور اطباء وغیرہ۔ اور اگر ان سب کے ذریعے بھی مصیبت نہیں ٹلتی تو وہ اپنے رب کی حمد و ثناء کرتے ہوئے دعا کرتا ہے اور اس کی بارگاہ میں گڑگڑاتا ہے۔

جب تک وہ اپنی مدد خود کرلیتا ہے، وہ مخلوق کی طرف رجوع نہیں کرتا اور جب تک وہ مخلوق سے مدد پاتا رہتا ہے، وہ خالق کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ پھر جب وہ (مخلوق سے مایوس ہوکر) رب کی طرف رجوع کرتا ہے اور جب وہ خالق کی مدد نہیں پاتا تو وہ رب کے درِ رحمت پر اپنے آپ کو گرادیتا ہے اور امید و رجاء کی کیفیت میں اس کی حمد و ثناء کرتے ہوئے اور گڑگڑاتے ہوئے اُس سے مدد مانگتا رہتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اُسے دعا کی قبولیت کے معاملے میں تاخیر سے دو چار فرماتا ہے، یہاں تک کہ آزمائش و مصیبت میں مبتلاء بندے کا جب تمام ظاہری اسباب سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اُس وقت اللہ تعالیٰ اس بندے میں قضاء و قدر کو جاری فرماتا ہے۔ تب بندہ تمام اسباب و علائق سے منقطع ہوجاتا ہے اور اُس کا جسم (موجود ہوتے ہوئے بھی) فنا ہوجاتا ہے اور فقط روح باقی رہ جاتی ہے۔ تب وہ ہر چیز کو فاعلِ حقیقی کا فعل ہی تصور کرتا ہے اور اس طرح وہ یقین اور توحید کے مقام پر فائز ہوجاتا ہے۔

اُسے یہ یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقی فاعل کوئی نہیں۔ اشیاء کو حرکت دینے اور ٹھہرانے والا وہی ہے۔ نیز یہ یقین بھی حاصل ہوجاتا ہے کہ خیر و شر، نفع و ضرر، عطاء و عدمِ عطاء، کشادگی اور بندش، موت و حیات، عزت و ذلت سب اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔ یقین حاصل ہونے کے بعد مصائب سے دو چار بندۂ مومن قضاء و قدر کے ہاتھوں میں اس طرح ہوجاتا ہے جیسے دودھ پیتا بچہ دایا کے ہاتھ میں، یا جیسے کوئی مردہ کسی زندہ کے ہاتھ میں، یا جیسے سوار کے ہاتھ میں سواری کی لگام جو پہلو بدلتا ہے اور سواری کو پھیرتا ہے نیز ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرتا ہے‘‘۔

(سید عبدالقادر جیلانی، فتوح الغیب، ص:۲۸)

حقیقتِ صبر

حضرت غوثِ اعظمؒ نے صبر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے درج ذیل آیات ذکر فرمائیں:

۱. یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا قف وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آل عمران،۳: ۲۰۰)

’’اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدمی میں (دشمن سے بھی) زیادہ محنت کرو اور (جہاد کے لیے) خوب مستعد رہو، اور (ہمیشہ) اللہ کا تقویٰ قائم رکھو تاکہ تم کامیاب ہوسکو‘‘۔

۲۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ . (النحل،۱۶: ۱۲۷)

''اور (اے حبیبِ مکرّم!) صبر کیجیے اور آپ کا صبر کرنا اللہ ہی کے ساتھ ہے''۔

☆ صبر کے حوالے سے قرآنی آیات کے بعد حضرت غوثِ اعظمؒ نے درج ذیل احادیث بھی ذکر کیں جن سے صبر کا تصور مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔

۱۔ سیدہ عائشہ ؓ روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ان الصبر عند الصدمة الاولى. (الحاکم، ۱: ۵۰۲)

''(حقیقی) صبر تو صدمہ کے آغاز میں ہوتا ہے''۔

۲۔ ایک آدمی نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں عرض کی:

يارسول الله! ذهب مالي وسقم جسمي. لا خير في عبد لا ذهب ماله ولا يسقم جسمه، ان الله تعالى اذا احب عبدا ابتلاه واذا ابتلاه صبره.

(الاتحاف، ۹: ۱۴۲، والمغنی عن حمل الاسفار، ۴: ۱۲۸)

''میرا مال جاتا رہا اور میرا جسم بیمار ہوگیا۔ تب رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اُس بندے میں بھلائی نہیں، جس کا نہ تو مال جائے اور نہ اس کا جسم بیمار ہو۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو اسے آزمائش سے دو چار کرتا ہے اور جب اسے آزمائش سے دو چار کرتا ہے تو اسے صبر دیتا ہے''۔

۳۔ حضور غوث الاعظم فرماتے ہیں کہ یہ روایت بھی صبر کی اصل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

ان الرجل لتكون له الدرجة عندالله عزوجل لا يبلغها بعمله حتى يبتلى ببلاء فى جسمه فيبلغها بذلك. (رواہ ابن حبان فی صحیحہ، والحاکم فی المستدرک)

بندۂ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں (اس کے فضل وکرم سے) ایک مقام ہوتا ہے جس تک وہ بندہ اپنے عمل کے ذریعے نہیں پہنچ پاتا، تب اللہ تعالیٰ اُسے (اپنی حکمت اور رحمت کے تحت) اُس کے جسم میں کسی مصیبت میں مبتلا فرماتا ہے تو وہ بندہ (مصیبت پر صبر اور رضا بالقضا کے ذریعے) اُس درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

(غنیۃ الطالبین، ص: ۳۲۶، ۳۲۷)

۴۔ حضور غوث الاعظمؒ صبر کی حقیقت کو احادیث سے ثابت کرتے ہوئے درج ذیل روایت کو بھی صبر کی اصل قرار دیتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: **مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ** (النسا: ۱۲۳) تو حضرت ابوبکر صدیقؓ بارگاہ رسالت ﷺ میں عرض گزار ہوئے:

يارسول الله كيف الفلاح بعد هذه الاية؟ فقال النبى ﷺ: غفر الله لك يا ابابكر اليس تمرض؟ اليس يصيبك البلاء؟ اليس تصبر؟ اليس تحزن؟ فهذا ماتجزون به. (غنیۃ الطالبین، ص: ۳۲۷)

''یارسول اللہ! اس بات کے بعد نجات اور فلاح کی کیا صورت ہوگی؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تمہیں تکلیف نہیں پہنچتی؟ کیا تم (تکلیفوں اور مصائب پر) صبر نہیں کرتے؟ کیا تم اداسی سے دوچار نہیں ہوتے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے تمہیں (کمی کوتاہی کی) جزا دی جاتی ہے''۔

نبی اکرم ﷺ کے فرمان کا معنی یہ ہے کہ تمہیں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہاری کوتاہیوں کا کفارہ ہوتی ہے۔

صبر کی اقسام

حضرت غوث اعظمؒ نے کتاب وسنت سے صبر کی فضیلت اور رضا بالقضا کی حکمت بیان کرنے کے بعد صبر کی درج ذیل تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

۱. احدها صبر لله عزوجل، وهو على اداء امره وانتهاء نهيه.

۲. وصبر مع الله عزوجل، وهو الصبر تحت جريان قضائه وافعاله فيك من سائر الشدائد والبلايا.

۳. وصبر على الله عزوجل، هوالصبر على ماوعد من الرزق، والفرج، والكفاية، والنصر، والثواب فى دار الآخرة. (غنية الطالبين، ص:۳۲۷)

۱۔ اللہ تعالیٰ کے لیے صبر کرنا: یعنی اس کے احکام کی تعمیل کرنا اور منع کئے ہوئے امور سے رکنا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی معیت پر صبر کرنا: یعنی اپنے آپ پر سختیوں اور مصائب کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور افعال پر صبر کرنا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر صبر کرنا: یعنی اللہ تعالیٰ نے رزق کی کشادگی، ضرورتوں کے پورا ہونے، اپنی مدد اور آخرت میں ثواب کے جو وعدے فرمائے ہیں ان پر صبر و استقامت سے یقین رکھنا۔

صبر: ائمہ کے اقوال کی روشنی میں

صبر کی اقسام بیان کرنے کے بعد حضرت غوث اعظمؒ نے صبر کی کثیر تعریفات بیان کی ہیں جس سے جہاں صبر کے ساتھ ان کی اپنی وابستگی کا پتہ چلتا ہے وہیں یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنے قارئین کو صبر کی چاشنی اور ثمرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

۱۔ حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ امور سے دوری، مصائب کے تلخ گھونٹ پیتے ہوئے پرسکون رہنا اور تنگ دستی کے باوجود فقر و فاقہ کو چھپانا صبر ہے''۔

۲۔ یہ بھی کہا گیا ہے:

''آزمائش کی گھڑیوں میں حسنِ ادب کا لحاظ رکھنا صبر ہے''۔

۳۔ صبر کے بارے میں ایک قول یہ ہے:

''مصائب و آلام میں شکوہ شکایت کے بغیر ڈوب جانا صبر ہے''۔

۴۔ ایک قول یہ بھی ہے:

''بیماری کو اسی طرح خوش دلی سے قبول کرنا صبر ہے جیسے صحت کو قبول کیا جاتا ہے''۔

۵۔ یہ بھی کہا گیا ہے:

''اللہ تعالیٰ کی معیت پر ثابت قدم رہنا اور اس کی طرف سے آنے والی تکالیف کو خوش دلی سے قبول کرنا صبر ہے''۔

۶۔ حضرتِ خواص نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کی معیت میں کتاب و سنت کے احکام پر ثابت قدمی صبر ہے''۔

۷۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نے فرمایا ہے:

''اہلِ محبت کا صبر زاہدوں کے صبر سے سخت ہے۔ تعجب ہے کہ اہل محبت کیسا صبر کرتے ہیں؟ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

الصبر یحمل فی المواطن کلها
الا علیك فانه لا یحمل

''سارے مقامات پر صبر ہوجاتا ہے مگر تیری فرقت پر صبر نہیں ہوتا''۔

۸۔ کہا گیا ہے:

''صبر شکوہ شکایت چھوڑ دینے کا نام ہے''۔

۹۔ یہ بھی کہا گیا ہے:

''صبر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عجز و نیاز کا اظہار کرنا اور اس کی پناہ مانگنا ہے''۔

۱۰۔ یہ کہا گیا ہے:

نعمت اور مصیبت میں دلجمعی کے ساتھ دل کی حالت کے نہ بدلنے کا نام صبر ہے، نیز مصیبت کے وزنی بوجھ کے باوجود پرسکون رہنے کا نام صبر ہے''۔ (غنیۃ الطالبین، ص: ۳۲۷، ۳۲۹)

عمل بالاسباب اور توکل

حضرت غوث اعظمؒ کی تعلیمات میں بیک وقت عمل بالاسباب، توکل اور رضا بالقضا کا درس ملتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

علیك بالکسب والتعلق بالسبب الی ان یقوی ایمانك، ثم انتقل الی المسبب الانبیاء علیهم السلام اکتسبوا واقترضوا وتعلقوا بالاسباب فی اول امرهم وفی الآخر توکلوا، جمعوا بین الکسب والتوکل بدایة ونهایة، شریعة وحقیقة. (الفتح الربانی، ص: ۹۹)

''اے مخاطب! تجھ پر لازم ہے کہ تو کسب اور سبب سے تعلق رکھے یہاں تک کہ تمہارا ایمان مضبوط ہوجائے پھر مسبب کی طرف منتقل ہوجاؤ۔ انبیاء علیہم السلام نے کمائی کی ہے، قرض لیا اور وہ شروع میں اسباب سے متعلق رہے اور آخر میں انہوں نے توکل کیا۔ انہوں نے شروع اور آخر میں شریعت اور حقیقت کے اعتبار سے کسب اور توکل کو یکجا کیا''۔

☆ دوسرے مقام پر فرمایا:

اعبدوا اللہ عزوجل واستعینوا علی عبادته بکسب

الحلال، ان الله عزوجل یحب عبدا مومنا مطیعا آکلا من حلاله، یحب من یاکل ویعمل، ویبغض من یاکل ولا یعمل، یحب من یاکل بکسبه، ویبغض من یاکل بنفاقه وتوکله علی الخلق. (الفتح الربانی، ص:۱۴۸)

''اللہ عزوجل کی عبادت کرو، نیز اُس کی عبادت پر حلال کمائی سے مدد حاصل کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ایسے مطیع اور مومن بندے سے محبت فرماتا ہے جو اُس کے حلال کیے ہوئے مال سے کھاتا ہے اور ایسے بندے کو ناپسند کرتا ہے جو کھاتا تو ہے مگر (معاش کے لیے) محنت نہیں کرتا، وہ ایسے بندے سے محبت فرماتا ہے جو اپنی محنت کی کمائی سے کھاتا ہے اور وہ ایسے انسان کو ناپسند کرتا ہے جو اپنے نفاق اور مخلوق پر بھروسے کی بنا پر کھاتا ہے۔

☆ ایک اور مقام پر اس حقیقت کو یوں واضح کیا:

اقول لکم: اجتهدوا فیه ودعوا التعلق بالسابقة فانه هوس منکم وحط، وحجة الکسالی، ماعلینا بالسابقة، نشد الاوساط ونتجهد ونعمل، ولا نقول: قال وقلنا، ولم وکیف؟ لا ندخل فی علم الله عزوجل، نحن نجتهد و هو یفعل ما یشاء. (الفتح الربانی،ص: ۱۷۵)

''میں تمہیں کہتا ہوں: (معاش کے لیے) کوشش کرو اور تقدیر کے ساتھ (جدوجہد سے منہ موڑ کر) چپکنا چھوڑ دو، یہ سست مزاج لوگوں کی دلیل ہے۔ ہم تو (نوشتۂ تقدیر کے باوجود) کمر باندھ کر جدوجہد کریں گے۔ ہم فقط یہ کہنے پر اکتفا نہیں کریں گے: ''فلاں نے کہا اور ہم نے کہا، کیوں؟ کیسے؟ اور نہ ہی اللہ کے علم میں داخل ہوں گے''۔ ہم کوشش کریں گے اور وہ (مالک) جو چاہے گا کرے گا''۔

☆ جدوجہد اور اسباب کو اختیار کرنے کے حوالے سے ایک مقام پر فرمایا:

جاهد فی طریق الحق عزوجل ولا تتکل علی قدره، اما سمعته کیف، قال: والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا. (العنکبوت: ۶۹)،(الفتح الربانی،ص:۳۰۵)

''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرو، اُس کی (طرف سے لکھی ہوئی) تقدیر پر بھروسہ کرکے بیٹھے نہ رہو، کیا تم نے نہیں سنا کہ وہ اُس نے کیسے فرمایا ہے: ''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم اُنہیں ضرور اپنے راستے دکھا دیں گے''۔

☆ حضور غوث الاعظم فرماتے ہیں کہ:

سالنی رجل: ای شیء یقرب العبد الی الله عزوجل؟ فقلت: لذلك ابتداء وانتهاء، فابتدوه الورع وانتهاوه الرضا والتسلیم والتوکل. (فتوح الغیب،ص:۱۴۳)

''ایک شخص نے مجھ سے پوچھا: بندے کو کیا چیز اللہ کے قریب کرتی ہے؟ تو میں نے اُسے کہا: قربِ الٰہی کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے۔ اُس کی ابتدا تقویٰ ہے اور اُس کی انتہا تسلیم و رضا اور توکل ہے''۔

تکلیف سے دو چار ہونے پر واویلا کرنے سے کبھی تکلیف ختم نہیں ہوتی، ہاں آدمی رب کی رحمتوں سے اپنا دامن بھرنے سے محروم ہوجاتا ہے۔ البتہ جن خوش نصیبوں کو صبر کی دولت مل جاتی ہے اور وہ رب کی رحمتوں کے حق دار ٹھہرتے ہیں،صبر سے آگے بڑھ کر جب بندہ رب کے فیصلوں پر راضی ہوجاتا ہے تو تسلیم و رضا کا یہ پیکر اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم کا حقدار بن جاتا ہے۔ شہادتِ سیدنا امام حسینؓ رضا بالقضا کی روشن ترین مثال ہے۔ صحابہ کرام، اہل بیت عظام، تابعین، تبع تابعین نے رضا بالقضا کی کثیر مثالیں قائم کی ہیں بلکہ علمائے دین اور اولیاء و صالحین سیدنا امام حسینؓ کی روشن کی گئی قندیل سے روشنی حاصل کرتے ہوئے ہر دور میں رضا بالقضا کی روشن مثالیں قائم کرتے رہے ہیں۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں بلند رتبہ لوگوں کے امتحان بھی کٹھن ہوتے ہیں جبکہ معصیت شعار لوگوں پر بھی تکالیف آتی ہیں مگر ہمیں اُن تکالیف کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور عنایات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اللہ کریم ہمیں صبر کرنے والا دل اور شکر کرنے والی زبان عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سیدالمرسلینﷺ

❁❁❁❁❁

تسخیرِ کائنات کے ضابطے

(1) ایمان.....(2) علم.....(3) عمل.....(4) اخلاص

ایمان کے نتیجے میں بندۂ مومن میں باطل کے خلاف ہمت و جرأت پیدا ہوتی ہے

شفاقت علی شیخ

ماہنامہ منہاج القرآن جنوری 2018ء میں راقم الحروف کا ایک مضمون بعنوان ''تسخیرِ ذات سے تسخیرِ کائنات تک'' شائع ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ انسان اس کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے جس کے لیے ساری کائنات کو مسخر کر دیا گیا ہے۔ انسان کے علاوہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے، وہ نہ صرف انسان کے لیے ہی بنایا گیا ہے بلکہ اس کے تصرّف میں بھی دے دیا گیا ہے۔ مگر اس امکان کو حقیقت کا رُوپ دینے اور عملی شکل میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان پہلے اپنی ذات کی تسخیر کرے یعنی اپنے خیالات، جذبات اور خواہشات وغیرہ پر قابو پائے اور اُنہیں نظم و ضبط کے دائرے میں لائے۔ ایسا کرنے سے ہی وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے ارگرد کے ماحول پر قابو پائے اور اُسے حسبِ منشاء استعمال کرتے ہوئے خلافتِ ارضی کی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن ادا کر سکے۔ زیرِ نظر مضمون کو اُسی کا اگلا حصہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں بتایا جارہا ہے کہ اس سفر کے لوازمات کیا ہیں؟

انسان کا اپنی ذات کو تسخیر کرنا اور اپنے خیالات، جذبات اور خواہشات کو قابو میں لانے کا لائحہ عمل (Road Map) کیا ہے جس پر چلتے ہوئے انسان کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سلسلے میں درج ذیل چار شرائط کو پورا کرنا لازمی ہے:

۱۔ ایمان ۲۔ علم ۳۔ عمل ۴۔ اخلاص

۱۔ ایمان

ایمان چند حقائق کو مان لینے کا نام ہے۔ وہ حقائق جو نہ تو حواس کے ذریعے محسوس کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی عقل کی رسائی اُن تک ہوتی ہے۔ مثلاً: خدا کا وجود، آخرت کا اقرار، جنت و جہنم وغیرہ۔ ان تمام حقائق کو جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ وحی ہے جو خدا اپنے منتخب بندوں (جنہیں پیغمبر کہا جاتا ہے) پر اُتارتا ہے۔ پھر یہ ماننا محض زبانی دعوے کی حد تک نہ ہو بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں تک اُتر جائے اور انسان کی شخصیت کو یکسر بدل کر رکھ دے۔

فرعون کے دربار میں جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے فرعون سے پوچھا:

اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ. (الاعراف، ۷: ۱۱۳)

''یقیناً ہمارے لیے کچھ اجرت ہونی چاہیے بشرطیکہ ہم غالب آجائیں''۔

مگر جب مقابلہ کے وقت حق اُن پر آشکار ہو جاتا ہے اور وہ ایمان کو قبول کر لیتے ہیں تو فرعون کی اس دھمکی کے جواب میں کہ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا کر تمہیں سُولی چڑھا دوں گا، وہ دوٹوک جواب دیتے ہیں:

لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا.

''ہم تمہیں ہرگز ان واضح دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو

☆ اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف لاہور

ہمارے پاس آ چکے ہیں، اس (رب) کی قسم جس نے ہمیں پیدا فرمایا ہے تو جو حکم کرنے والا ہے کر لے، تُو فقط (اس چند روزہ) دنیوی زندگی ہی سے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے''۔ (طٰہٰ،۲۰:۷۲)

چند لمحے پہلے وہ نیاز مندی کہ للچائی ہوئی نظروں سے فرعون کے مال دولت کی طرف دیکھ رہے تھے اور اب یہ بے نیازی کہ موت کو بھی گلے لگانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ یہ ساری تبدیلی ایمان کی ہی مرہونِ منت ہے۔

ایمان کے نتیجے میں ایک بندہ مومن میں یہ ہمت و جرأت کیسے پیدا ہوتی ہے، اس کو سمجھنے کے لیے تین نکات پر غور کریں:

(ا) ایمان باللہ

اللہ پر ایمان رکھنے والے شخص کو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی طاقتوں اور قدرتوں پر پختہ یقین ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اُس کے تابع ہے اور اُس کی مرضی و منشاء کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ نیز اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بھی وجود اُس کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ دوسری طرف اُسے اللہ تعالیٰ کے اُن وعدوں کی صداقت پر کامل یقین ہوتا ہے جو اُس نے اپنے بندوں کے ساتھ قرآنِ مجید میں جا بجا فرمائے ہیں:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الروم،۳۰: ۴۷)

''اور مومنوں کی مدد کرنا ہمارے ذمۂ کرم پر تھا (اور ہے)''۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

''اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہو''۔ (آل عمران،۳: ۱۳۹)

یہ یقین ایک بندہ مومن کو ہر خوف سے بے خوف کر دیتا ہے اور وہ ہر معرکہ میں مردانہ وار کود پڑتا ہے۔

(ب) ایمان بالاخرہ

زندگی کے معرکہ میں جو چیزیں انسان میں خوف و ہراس اور بزدلی و پست ہمتی پیدا کرتی ہیں اُن میں سے ایک یہ احساس ہے کہ وہ ایک فانی مخلوق ہے اُس کا کوئی اقدام اُس کی موت کا پیغام نہ بن جائے اور وہ ہمیشہ کے لیے فنا نہ ہو جائے۔ لیکن آخرت پر ایمان کے نتیجے میں ایک بندہ مومن نہ تو اس زندگی کو اصل زندگی سمجھتا ہے اور نہ ہی موت کو زندگی کا خاتمہ۔ بلکہ اُس کے نزدیک تو یہ مختصر سی زندگی اُس اصل زندگی کا دیباچہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے، موت اُس کی نظر میں ایک پردہ ہے جس کے پیچھے ابدی اور دائمی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موت کا احساس اُسے بزدل نہیں بناتا۔ اس کے برعکس وہ آگے بڑھ کر حق کی خاطر موت کو گلے لگا لیتا ہے اور موت کے بعد اللہ کی رضا اور ابدی زندگی کی نعمتوں کو پالیتا ہے۔

(ج) ایمان بالقدر

تیسری چیز جو ایک بندہ مومن کے لیے قوت کا باعث بنتی ہے وہ اُس کا تقدیر پر محکم ایمان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو مصیبت بھی اُسے پہنچتی ہے، اللہ کے اذن سے ہی پہنچتی ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. (التوبہ،۹:۵۱)

''(اے حبیب!) آپ فرما دیجیے کہ ہمیں ہرگز (کچھ) نہیں پہنچے گا مگر وہی کچھ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہی ہمارا کارساز ہے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے''۔

نیز وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر قسم کی صورتِ حال میں اُس کے لیے خیر ہی خیر ہے:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ.

''اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لیے بہتر ہو''۔ (البقرہ،۲: ۲۱۶)

یہ ہیں وہ بنیادی اعتقادات جن کے نتیجے میں انسان کے اندر ایسی زبردست قوت پیدا ہوتی ہے جو تمام خطرات اور وساوس کا قلع قمع کر دیتی ہے اور وہ بے خوف و خطر زندگی کے ہر معرکے میں حصہ لیتا ہے اور سود و زیاں کے اندیشوں سے بالا تر ہو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تسخیر کائنات تو غیر مسلموں نے بھی کی ہے۔ اُنہوں نے بھی ستاروں اور سیاروں پر کمندیں ڈالی ہیں، پہاڑوں کا جگر کاٹ کر راستے بنائے ہیں، سمندروں کا رُخ موڑا ہے اور طوفانوں کے آگے بند باندھے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر غیر مسلموں نے بھی بہت سے ایسے کام کیے ہیں مگر یہ سب اسباب کے دائرے میں ہیں۔ ایک صاحبِ ایمان شخص اسباب کو استعمال تو ضرور کرتا ہے مگر وہ اسباب کا پابند نہیں ہوتا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامتیں اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہوئے ہزاروں میل پر لڑنے والے اسلامی لشکر کی حرکات وسکنات کو دیکھنا اور بغیر کسی ظاہری واسطے کے اُن تک پیغام پہنچانا، زلزلہ آنے پر زمین پر پاؤں مارکر اُسے تھم جانے کا حکم دینا اور زلزلہ کا رُک جانا، دریائے نیل کے نام خط لکھنا اور اُس کا چل پڑنا، یہ سب معاملات ماورائے اسباب ہیں اور ایمان ہی کے مرہونِ منت ہیں۔

۲۔ علم

تسخیرِ کائنات کے سفر میں ایمان کے بعد جو دوسری بڑی طاقت ہے وہ علم ہے۔انسانیت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں علم کا بہت زیادہ کردار ہے۔ ہر دور میں وہی قومیں قیادت کے منصب پر فائز ہوئیں جو علم میں دوسروں سے آگے تھیں۔ جس زمانے میں مسلمان علمی میدان میں برتری کے حامل تھے اُس وقت امامتِ عالم کا تاج بھی انہی کے سر پر سجا ہوا تھا لیکن جب سے علم کی دوڑ میں مغربی اقوام آگے بڑھ گئی ہیں، زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی قائدانہ حیثیت اُنہی کو حاصل ہے اور مسلمان ہر معاملے میں اُن کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام بڑے ٹھوس اور محکم قوانین پر اُستوار کیا ہے:

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا. (الطلاق،۶۵:۳)

’’بے شک اللہ نے ہر شے کے لیے اندازہ مقرر فرما رکھا ہے‘‘۔

یہ قوانین اتنے اٹل ہیں کہ ان میں کسی بھی قسم کا تغیر و تبدل ممکن ہی نہیں:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا.

’’اللہ کی (یہی) سنّت اُن لوگوں میں (بھی جاری رہی) ہے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائیں گے‘‘۔ (الاحزاب،۳۳:۶۲)

چنانچہ اس کائنات میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کی تہہ میں کوئی نہ کوئی قانون کام کر رہا ہوتا ہے جسے سائنس کی زبان میں علت ومعلول کا قانون (Law of Cause & Effect) کہتے ہیں ۔ یہاں تک کہ کسی درخت کی شاخ سے ایک پتہ بھی کسی قانون کے بغیر نہیں گرتا ہے۔ علم کائنات کے سر بستہ رازوں کو انسان پر آشکار کرتا ہے اور اُن قوانین کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو تمام حرکات وسکنات کے پسِ پردہ کار فرما ہیں۔ چنانچہ علم کی بدولت انسان کے لیے مظاہرِ کائنات کی حقیقت کو سمجھ کر اُن پر تصرف کرنا اور اُنہیں اپنے لیے مفید بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ جو قومیں آج ترقی کے بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں اور بحروبر پر حکمرانی کر رہی ہیں اُن کے پیچھے یہی علم کی قوت ہے۔ سائنس کی تمام ایجادات و اکتشافات علم ہی کے مرہونِ منت ہیں۔

جس طرح کائنات کا کارخانہ مخصوص قوانین کے تحت چل رہا ہے، اسی طرح خالقِ کائنات نے زندگی کی بقاء، ارتقاء اور نشونما کے بھی قوانین بنا رکھے ہیں۔ عروج و زوال اور فنا و بقاء کو خاص ضابطوں کا پابند بنا رکھا ہے۔علم کے ذریعے اُن قوانین کو جان کر زندگی کے معیار کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے اور کامیابی، ترقی اور عروج کی فطری خواہش کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک وسیع کائنات موجود ہے جہاں جذبات، خیالات، خواہشات، آرزوئیں، اُمنگیں اور تمنائیں ہیں۔علم کے ذریعے اپنے من کی دنیا میں جھانک کر ان چیزوں کو نظم و ضبط کا پابند بنا کر اپنی شخصیت کو مہذب اور پاکیزہ بنا یا جاسکتا ہے۔شخصیت کے منفی رجحانات پر قابو پا کر مثبت رویوں کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے اور اپنی ذات کو اتنا نفیس بنایا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کے باغ میں ایک پھول کی طرح مہکتے ہوئے ماحول کو معطر کرے، سورج کی طرح روشنی بکھیرتے ہوئے ماحول کو منور کرے اور مرنے کے بعد جنت کی حسین و جمیل وادیوں میں بسنے کے قابل ہو سکے ۔ چنانچہ علم انسان کو دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں مطلوب اور پسندیدہ بنا دیتا ہے۔

حضرت سلمان علیہ السلام نے اپنے دربار میں بلقیس کے آنے

سے پہلے اُس کا تخت منگوانا چاہا تو پہلی آفر طاقتور جن کی طرف سے آتی ہے کہ میں آپ کے دربار کے برخاست ہونے سے پہلے تخت لے آؤں گا۔ اس کی یہ آفر ٹھکرادی جاتی ہے۔ پھر ایک علم والا اُٹھتا ہے اور وہ پلک جھپکنے سے پہلے تخت لانے کی پیشکش کرتا ہے۔ یہاں موازنہ طاقت اور علم کا ہو رہا ہے۔ پھر دیے گئے وقت میں تخت کا آجانا ظاہر کر رہا ہے کہ علم کی طاقت جنات کی طاقتوں سے بڑھ کر ہے۔ یہاں سے علم کی برکت اور تاثیر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پھر جب پوچھا جاتا ہے کہ تخت کیسے آیا؟ تو وہ اُسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہوئے اپنے حوالے سے ہر کمال کی نفی کر دیتا ہے اور اُسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ یہاں سے حقیقی علم کا ایک پیمانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں حقیقی علم ہوتا ہے وہاں تواضع، عاجزی اور انکساری جیسے اوصاف آتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں تکبر، انا نیت اور گھمنڈ کی سوچ ہو تو وہاں صحیح معنوں میں علم نہیں ہوتا۔ بہر حال اس واقعہ سے واضح ہو رہا ہے کہ طاقت اور علم میں مقابلہ ہو تو تفوق اور برتری علم کو حاصل ہوتی ہے۔

دینا میں بڑے بڑے انقلابات علم کی طاقت سے ہی برپا ہوتے ہیں۔ علم سے مراد دکوئی مخصوص علم نہیں ہے بلکہ ہر قسم کا علم ہے۔ یہ علم مذہبی بھی ہوسکتا ہے اور سیکولر بھی، روحانی بھی ہوسکتا ہے اور مادی بھی، دین کا بھی ہوسکتا ہے اور دنیا کا بھی، قدیم بھی ہو سکتا ہے اور جدید بھی، کسی مخصوص شعبے (Specific Field) کا بھی ہوسکتا ہے اور عمومی (General) بھی۔ ایک شخص جو کسی بھی فیلڈ میں ہے، مثلاً: ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ تو جب تک وہ اپنے مخصوص شعبے کے حوالے سے علمی پختگی کا حامل نہیں ہوگا، کوئی بہت زیادہ ترقی نہیں کر سکے گا اور نہ ہی اس میں اپنا مقام بنا سکے گا۔ اور عمومی علم سے مراد ہے کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ قومی معاملات کیا ہیں اور بین الاقوامی مسائل کیا ہیں؟ دنیا کن خطوط پر آگے بڑھ رہی ہے ۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں کیا ترقیاں (Development) ہو رہی ہیں وغیرہ۔ جو شخص جس معاملے میں جتنا زیادہ علم حاصل کرے گا اُس کی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے امکانات اُتنے ہی زیادہ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۳۔ عمل

علم سے اگلا مرحلہ عمل کا ہے ۔عمل سے مراد یہ ہے کہ علم کے نتیجے میں جو حقائق انسان پر منکشف ہوئے ہوں، زندگی کو اُن سے ہم آہنگ کیا جائے ۔فطرت کے جن قوانین کو علم نے آشکار کیا ہو، اُن کے مطابق عملی زاویوں کی اصلاح کی جائے اور روزمرہ کی سرگرمیوں کا رُخ اُن کے مطابق متعین کیا جائے۔

جس طرح چراغ جلے بغیر روشنی نہیں دیتا، اُسی طرح علم بھی عمل کے بغیر فائدہ نہیں دیتا، بالفاظِ دیگر نسخہ کتنا ہی بہترین ہو لیکن جب تک اُسے استعمال میں نہ لایا جائے مریض کو فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح انسان کتنا ہی اعلیٰ درجے کا علم حاصل کر لے اور حکمت و دانائی کی کتنی ہی باتوں کو جان لے، جب تک اُنہیں عملی سانچے میں نہیں ڈھالا جائے گا سب کچھ بے کار رہے۔ غور سے دیکھا جائے تو علم کا مقصود ہی عمل ہے۔ عمل کے بغیر علم محض معلومات کا انبار ہے جو انسان کو کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآنِ مجید میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوْا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا. (الجمعہ،۶۲:۵)

''اُن لوگوں کا حال جن پر تورات (کے احکام و تعلیمات) کا بوجھ ڈالا گیا پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا (یعنی اس میں اِس رسول (ﷺ) کا ذکر موجود تھا مگر وہ اِن پر ایمان نہ لائے) گدھے کی مِثل ہے جو پیٹھ پر بڑی بڑی کتابیں لادے ہوئے ہو''۔

گویا قرآنِ مجید کے مطابق وہ علم جو عمل میں نہ آئے گدھے پر رکھے ہوئے اُس بوجھ کی مانند ہے جس کا کوئی فائدہ تو نہیں ہو رہا لیکن مشقت برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔ بقول حضرت واصف علی واصفؒ: ''علم وہی ہے جو عمل میں آجائے، ورنہ اضافی بوجھ ہے''۔

قرآنِ مجید میں جابجا ایمان کے ساتھ عمل کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ نظریات اُسی وقت باوقعت بنتے ہیں، جب اُن کے مطابق عمل کیا جائے۔ دنیا کی

ساری رونقیں حرکت اور عمل سے ہی عبارت ہیں جب کہ بے عملی اور جمود موت ہیں۔ جتنی بھی ترقیاں اور انواع و اقسام کی ایجادات دکھائی دے رہی ہیں، یہ سب عمل ہی کی وجہ سے وجود میں آئیں۔ دنیا سے لے کر آخرت تک کی تمام سعادتوں کا دارو مدار عمل پر ہی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

فطرت کا اٹل اُصول ہے کہ انسان نے جو کچھ بھی حاصل کرنا ہے اُس کے لیے کوشش اور جدو جہد کرنا ہوگی۔ اس لیے کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. (النجم،۵۳:۳۹)

''اور یہ کہ انسان کو (عدل میں) وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہو گی (رہا فضل اس پر کسی کا حق نہیں وہ محض اللہ کی عطاء و رضا ہے جس پر جتنا چاہے کر دے)''۔

۴۔ اخلاص

عمل کے بعد ایک قدم اور ہے جسے اخلاص کہتے ہیں۔ اخلاص کا مطلب ہے اپنے تمام افکار ونظریات، اعمال و افعال اور حرکات وسکنات کو اللہ کے لیے خالص کر لینا۔ یعنی ہر کام فقط رضائے الٰہی کی نیت سے کرنا، کوئی اور غرض وغایت نہ رکھنا۔

یہ اخلاص بندگی کی روح بھی ہے اور ایک بندہ مومن کی زندگی کا نصب العین بھی۔ قرآن میں جا بجا اس کی تاکید کی گئی ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (الانعام،۶:۱۶۲)

''فرما دیجیے کہ بے شک میری نماز اور میرا حج اور قربانی (سمیت سب بندگی) اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا.

''(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو محض اللہ کی رضا کے لیے تمہیں کھلا رہے ہیں، نہ تم سے کسی بدلہ کے خواستگار ہیں اور نہ شکرگزاری کے (خواہشمند) ہیں''۔ (الانسان،۷۶:۹)

جتنا زیادہ کسی عمل میں اخلاص ہوتا ہے، اُتنا ہی وہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول اور قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

من احب للّٰه و ابغض للّٰه و اعطى للّٰه و منع للّٰه فقد استكمل الايمان

''جس نے اللہ کے لیے کسی سے محبت کی اور اللہ کے لیے ہی نفرت کی، اللہ کے لیے ہی کسی کو دیا اور اللہ کے لیے ہی نہ دیا اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا''۔

اخلص دينك يكفك العمل القليل

''اپنے دین کو خالص کر لے پھر تیرا تھوڑا عمل بھی کافی ہو جائے گا''۔

اخلاص کی بدولت اعمال کی قدرو قیمت میں اضافہ کو مادی مثالوں کے ذریعے بھی سمجھا جا سکتا ہے:

i۔ دودھ سے کریم بنتی ہے، کریم سے مکھن اور مکھن سے گھی نکالا جاتا ہے۔ ان سب کی قیمتوں میں جو فرق ہے وہ خالصیت کی بنیاد پر ہی ہے۔

ii۔ گلاب کے پھولوں سے عرق بھی بنتا ہے اور عطر بھی لیکن عرقِ گلاب کی بڑی بوتل کے مقابلے میں عطر کی چھوٹی سی شیشی کہیں زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ یہ فرق بھی خالصیت کی مقدار کے فرق کی بنا پر ہی ہے۔

مندرجہ بالا چاروں چیزیں جس شخص کے اندر جس درجہ میں جمع ہوتی چلی جائیں گی اُسی تناسب سے اُس کے اندر تسخیر کی طاقت پیدا ہوتی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات کے اندر فاعل بنا کر بھیجا ہے لیکن وہ مفعول بن کر رہ گیا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ میرا بندہ کائنات کو مسخر کرے اور نیابتِ الٰہی کے منصب کی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے ماحول میں مؤثر کردار ادا کرے لیکن انسان اپنی نفسانی خواہشات اور پست جذبات کا غلام بن کر اپنے آپ کو مقامِ انسانیت سے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لے آیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے اور دنیا کی سٹیج پر اپنا پھر پور کردار ادا کرتے ہوئے اپنے رب کی رضا اور آخرت کی سعادتیں حاصل کرے۔ (وماتوفیقی الا باللہ) ❁❁❁❁❁

شہزادۂ غوث الوریٰ السید یوسف بن محمود حسام الدین القادری الگیلانی البغدادی کا وصال

گزشتہ ماہ تحریک منہاج القرآن کے روحانی سرپرست قدوۃ الاولیاء حضور پیر سیدنا طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی البغدادی ﷺ کے برادر اکبر السید یوسف بن محمود حسام الدین القادری الگیلانی البغدادیؒ عراق (بغداد) میں انتقال فرما گئے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے مرحوم کے انتقال پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ سیدی و مرشدی حضور قدوۃ الاولیاء سیدنا طاہر علاؤ الدین القادری الگیلانی البغدادی علیہ الرحمۃ والرضوان کے بردار اکبر شہزادہ غوث الوریٰ السید یوسف بن سید محمود حسام الدین القادری الگیلانیؒ کی وفات حسرت آیات کی خبر سن کر دلی صدمہ پہنچا ہے۔ آپ حضور شیخ الکل غوث الثقلین سیدنا شیخ عبد القادر الجیلانی ﷺ کے خانوادہ کے عظیم فرزند، بغداد شریف کی خانقاہ قادریہ کے سجادہ نشین اور متولی الاوقاف القادریہ تھے۔ آپ کی رحلت خانوادہ گیلانیہ کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان تو ہے ہی لیکن آپ کے انتقال پُر ملال سے پوری ملتِ اسلامیہ ایک عظیم روحانی شخصیت سے محروم ہوگئی ہے۔ آپ نے درگاہ قادریہ کی جانشینی کے زرّیں عہد میں مخلوقِ خدا کی اِصلاحِ اَحوال اور رُشد و ہدایت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ تعالی خانوادہ گیلانیہ کے متوسلین، معتقدین اور محبین کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے، دین وملت کے لیے ان کی ہمہ گیر خدمات کو قبول فرمائے، اپنی رحمت ورضا نصیب فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ منہاج القرآن کے جملہ ذمہ داران، عہدیداران، کارکنان غم کی اس گھڑی میں سوگوار خاندان کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔

☆ تحریک منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ پر بزم قادریہ کے زیراہتمام شہزادۂ غوث الوریٰ السید یوسف ضیاء الدین القادری، الگیلانی البغدادیؒ کی یاد میں دعائیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں ان کی دین و انسانیت کیلئے خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ چیئرمین سپریم کونسل منہاج القرآن محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے دعائیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خانوادۂ حضور سیدنا غوث الاعظم کی خوشی منہاج القرآن کی خوشی اور ان کا دکھ تحریک منہاج القرآن کا دکھ ہے۔ حضرت السید یوسف ضیاء الدین القادری الگیلانی البغدادیؒ کا انتقال تحریک منہاج القرآن، معتقدین، مریدین اور سوگوار خاندان کیلئے بڑا سانحہ ہے۔ مرحوم نے ساری زندگی نیکی کے کاموں، خدمتِ خلق، دین اسلام کی ترویج اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کو عام کرنے میں بسر کی۔

اس دعائیہ تقریب میں منہاج القرآن کے جملہ مرکزی قائدین، سٹاف ممبران اور رفقاء و کارکنان کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور مرحوم کی بلندی درجات کے لیے خصوصی دعا کی۔ ☆☆☆☆

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا

فروغِ امن اور انسدادِ دہشت گردی کیلئے اِسلامی نصاب

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
NOV-2020
Regd CPL No.41

میلاد النبی ﷺ پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی گراں قدر تصانیف